فہرست غزلیات پیام شوق حصہ دوم

غزل	صفحہ
ردیف الف	
کوئی پیمانہ شراب نہ تھا	۱
جلوہ گاہِ حسن میں میں ایک ہی بیگانہ تھا	۲
درد کا سینہ میں گھٹ گھٹ کے پریشاں ہونا	۳
دل نہ تھا وفا شعار اسی کو بھلا دیا	۴
یہ وہ دل ہے کہ جو منت کش درماں نہیں ہوتا	۵
زمانہ نقش و نگارِ طلسمِ خواب ہوا	۶
چاک داماں کر دیا ٹکڑے گریباں کر دیا	۷
سکونِ دل ہی ملا اور نہ غمگسار آیا	۷
عشق میں اے جنوں نواز وحشتِ دل بڑھائے جا	۸
میں وہاں ہوں کہ جہاں حشر بپا کیا ہوگا	۱۰
دست وحشت جو بڑھا تار گریباں نہ ملا	۱۰
آئے دن عشق و محبت میں یہ جھگڑا کیسا	۱۱
کام آنا تھا دل وارفتہ کام آ ہی گیا	۱۲
چلتی پھرتی نگاہ نے مارا	۱۳
خموشی پھولوں کا حسنِ بیاں نہیں ملتا	۱۳
ردیف ر	
دعائیں خاک مانگوں اپنے دلِ ناداں سحر ہو کر	۱۴
انجمن ہے دل میں یادِ مسیحا کئے بغیر	۱۵
ردیف س	
رہ چکے ہیں ایک مدت دل سے بیگانے کے پاس	۱۶
ردیف ق	
وہ مری ناصیہ سائی تھی وہ بتخانۂ عشق	۱۷
ردیف ک	
رہی محدود سرگرمی تلاشِ ساز و ساماں تک	۱۸
دیکھئے آہ کی تاثیر اثر ہونے تک	۱۸
ردیف ل	
کیا رنگ لائے دیکھئے سودائے خام دل	۱۹

غزل	صفحہ
ردیف م	
…کار یہ دلِ ناداں ہے اور ہم	۲۰
…ے راز محبت ہوش سے بیگانہ ہم	۲۱
…ا رہبر حجاب جھکتے پردہ حائل سے ہم	۲۲
…م دیا چھین کر ساقی سے پیمانہ ہم	۲۲
…ور جنبے دیدۂ تری درد پہنچائیں گے ہم	۲۳
ردیف ن	
…س ضبط ہے رنج سے کچھ آشنا نہیں	۲۴
…را تیرے ہی میں رنگ گلستاں دیکھ لیتا ہوں	۲۵
…ں جو تھا وہ کھل گیا ناز میں اور نیاز میں	۲۶
…دل سا ہو یا کوئی اعجاز ہے شمشیر قاتل میں	۲۶
…ہر ہوں مگر جلوۂ کثرت سے جدا ہوں	۲۷
…ق کو جس کے لئے حاجت رہبری نہیں	۲۸
…ہ جلوے حسن کے ہم کو دکھائے جاتے ہیں	۲۹
…ر ضبط ہوں اور ضبط میں تاثیر نہیں	۲۹
…ت تیرا زینت کاشانہ ہوا جاتا ہوں	۳۰

غزل	صفحہ
یونہی ہم طبیعت کو بہلا رہے ہیں	۳۱
دل والے پہلے دیدۂ دل پر نظر کریں	۳۲
چاندنی کی رات زندگی عمرِ رواں سمجھا تھا میں	۳۳
کس کیلئے بتا ہے کیا آرزو کریں	۳۳
حالِ زارِ دل تصور میں بتا سکتا ہوں میں	۳۴
دیوانہ پن بھلا کہ کوئی بدگماں نہیں	۳۵
سوزِ نہاں ہو دردِ جگر اس میں کمی کہاں	۳۶
سحر اٹھ اٹھ کے کیا کیا شکوۂ بیداد کرتا ہوں	۳۶
گلستانِ محبت میں بہارِ بے خزاں ہوں میں	۳۷
نہاں ہے رازِ عجب پردۂ حقیقت میں	۳۹
چشمِ حیراں تجھے کیوں اور بھی حیراں نہ کروں	۴۰
محبت کو بھڑکا کے اسے کامل سمجھتا ہوں	۴۱
بگڑی شکلیں کیا بنانی آگئیں	۴۲
ردیف واؤ	
دل جیسے دیوانے کو	۴۳
بادہ کش وہ ہو کہ مستی میں بھی جسکو ہوش ہو	۴۴

غزل	صفحہ	غزل	صفحہ
قصۂ درد رفتگاں نہ سنو	۴۵	درد دل اٹھتا ہے اک سوز نہاں ہوتا ہے	۶۵
گناہ گار کا جنت پہ اصرار کیوں ہے	۴۶	منزلیں آگہی تھیں عشق کی آساں نہ کر سکے	۶۶
کھینچ کر لایا یہاں کیوں دل ناداں مجھکو	۴۷	ہائے جان دل سفاک تیری ہر ادا نکلی	۶۸
ردیف ی		کھل گیا راز محبت بات من مانی ہوئی	۶۹
دل کہہ رہا ہے کب سے درد جگر نہیں ہے	۴۸	تری اے حسن دلکش جلوہ آرائی نہیں جاتی	۷۱
محبت بھی شریک حال فطرت ہوتی جاتی ہے	۵۰	کوئی جز زمزمہ زن تار رباب تھا رہے	۷۳
شوق سجدہ کیوں تلاش آستاں میرے لئے	۵۱	منور آجکل بزم جہاں معلوم ہوتی ہے	۷۴
نہ لب ہلاتے نہ اظہار آرزو کرتے	۵۲	دل میں آتی ہے خلش شاید کوئی پیکاں بھی ہے	۷۶
ایک نظر ادھر بھی ہو موسم گل بہار ہے	۵۳	بتوں کے در سے اٹھایا نہ سر کبھی میں نے	۷۷
وہ چشم و دل سے پردہ اٹھا کر چلے گئے	۵۵	پہلے جنوں کی خستگیاں کیسی	۷۹
دل میں ازل سے آئے تھے حسرت لئے ہوئے	۵۶	کھوئے گئے کچھ ایسے کہ شرما کے رہ گئے	۷۹
میری خاموشی ازل سے ہے لب اظہار بھی	۵۸	مطلب کچھ فنا سے نہ خواہش بقا کی ہے	۸۱
دل کہ محویت ہے نہ کچھ امتیاز ہے	۵۹	آخر کو حال پر غم کہنا ہے کیا کسی سے	۸۲
عشق کا راز ہی کیوں دل سے نمایاں ہو جائے	۶۱	یہ وہ دل ہے جو نہیں مائل فریاد بھی	۸۴
ہے شوق دید دیدۂ غافل لئے ہوئے	۶۲	جو ہے ہونا وہی تو ہوتا ہے	۸۵
مستی میں ہوشیار وہ دیوانہ نہیں ہے	۶۳	کہانی کیا سنو گے داغہائے سوز ہجراں کی	۸۶

غزل	صفحہ	غزل	صفحہ
پلائی ساقی نے ایسی کہ بیہوشی نہ رہی	۸۷	غمِ پیہم کی کلفت جزوِ فطرت ہوتی جاتی ہے	۱۰۰
کیسا دورِ گردشِ ایام ہے	۸۹	دل الجھیں دیکھ کے دیوانہ ہوا جاتا ہے	۱۰۱
اگر اے شوق بے پردہ جمالِ یار ہو جائے	۹۰	داغِ دل ہم سے کسی طرح دکھائے نہ گئے	۱۰۲
آن پڑی جب سر پہ اپنے ہنسنا ہنسانا بھول گئے	۹۱	سن لیجئے غریب کا آخر سوال ہے	۱۰۳
وہاں میں تو جہاں آسودگی معلوم ہوتی ہے	۹۳	دلِ محوِ عشق شاہدِ عکسِ جمال ہے	۱۰۴
زباں پہ دیکھئے لائے نہ لائے خامشی اپنی	۹۴	نرگس بتا کہ نکہتِ گلشن کدھر گئی	۱۰۵
لاکھ ڈھونڈا نہ ملے تار گریبانوں کے	۹۵	طالبِ دیدار ہوں پھر کس لئے پردہ مجھ سے	۱۰۶
ستم رسیدوں کا کچھ اعتبار رہنے دے	۹۶	وحشت کا ایسا نقش بٹھا ہستی مٹا کر اٹھے	۱۰۸
نہ جانے عشق میں کس کس سے ملتجی ہو گی	۹۷	کیا بحث اب بھی آہِ رسا کے اثر میں ہے	۱۰۹
سحر سے تکتے تکتے اب مہر کرم نگاہ آئی	۹۸	کاش پیدا اک ندا ہو سازِ پر اسرار سے	۱۱۰
ملے جنوں آج دکھا کارِ نمایاں کوئی	۹۹	سینۂ داغدار کیا کم ہے۔	۱۱۱
ہماری خامشی کو وہ ادائے بے زباں سمجھے	۹۹	سحر ہونے دو پوچھینگے نسیمِ کوئے دلبر سے	۱۱۲

صحت نامہ اغلاط پیام شوق حصہ دوم

صفحہ	سطر نمبر مصرعہ نمبر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر نمبر مصرعہ نمبر	غلط	صحیح
۳	۱۴/۱	دکھا	دیکھا	۲۴	۲/۲	اُسی	اِسی
۸	۱۱/۱	تچا	بچا	۳۱	۱۴/۲	بچھوا	بجھوا
"	۱۲/۱	باب	رَباب	۳۳	۱۳/۲	ناکامی	نادانی
۹	۱۴/۱	ہو	ہے	"	۱۲/۱	دھو	دھوکا
۱۱	۵/۱	پاتے	پیتے	۳۴	۵/۲	اس کی	اُس کی
"	۲/۲	آزاد	آزار	۳۵	۱۴/۲	صرفِ	حرفِ
"	۱۴/۲	کہ	یہ	"	۷/۱	ذرّہ	ذرّے
"	۱۳/۲	کہ	یہ	۳۹	۱۰/۲	شکوہ	شکوۂ
۱۴	۲/۲	گناہیں	نگاہیں	"	۵/۲	سرگرمیاں	سرگرمیاں ہیں
۱۶	۱۱/۲	او	اور	۴۲	۲/۲	سنائی	سُنائی
۱۸	۱/۱	محویت	محویت ہے	۴۶	۵/۴	التجا کے	التجائے
۱۹	۵/۲	ہے	سے	"	۲/۲	آکے	جو آئے
۲۱	۲/۳	مے	ہئے کو	"	۱۰/۲	عہ	لعہ
"	۴/۳	تشنہ	نشۂ	۵۱	۱/۱	یعنی	معنیٔ
۲۲	۱/۱	ساحل	سائل	۵۲	۳/۲	آتے آتے	ڈھونڈ رکھو
"	۱۰/۲	لب ساحل	لب سبل			آئیگی	کوئی سی طرز
۲۳	۷/۲	بیبا گانہ	بیگانہ				نخال

صفحہ	سطر نمبر مصرعہ	غلط	صحیح
۵۲	۱/۷	ہوں	ہزاروں
۵۶	۱/۲	نقشِ نگار	نقش و نگار
۶۱	۲/۲	ہوں	یوں
۶۴	۱/۲	لو	لو
"	۲/۷	پردہ	پردے
۶۵	۱/۱	تیر	بستر
"	۲/۱	داینده	دانندہ
۶۶	۲/۷	آسان	انسان
۶۸	۲/۳	کششِ سحر	کشش سے
۶۹	۱/۷	گلچین وچمن	گلچین وچمن
۷۰	۱/۱	دن دنوں	ان دنوں
"	۲/۲	عشق	عشقِ بستم
"	۱/۴	دُردہ	دُردی
۷۱	۲/۳	آرائی	فرمائی
۷۳	۲/۳	دویار	دوچار
"	۲/۷	سرشار	سرشارو
۷۹	۱۲/۳	رکہی	رکھی
۸۴	۱/۷	اُف	اُو
۸۵	۱/۵	بھکا	جھکا
۸۶	۲/۵	بلائیں	بلاہیں

صفحہ	سطر نمبر مصرعہ	غلط	صحیح
۱۰۱	۱/۱	گر	گہ
۱۰۴	۱/۱	بیلیس	بیکیس
۱۰۵	۱/۱	ملنا	مانا ہے
۱۰۹	۳/۱	خبر	خبر بھی

(نظامی پریس بدایوں)

اوم

۷۸۶

پیامِ شوق حصہ دوم

سنہ ۱۹۳۰ء

کوئی پیمانۂ شراب نہ تھا ——— فیضِ ساقی تھا کچھ حساب نہ تھا
بادہ خوارو ذرا سی چکھ لینے ——— تیز کتنی کچھ مزہ خراب نہ تھا
کھل گیا نیم باز آنکھوں سے ——— درحقیقت وہ مستِ خواب نہ تھا
جھیل لیں جو مصیبتیں آئیں ——— اپنا ہی درخورِ عذاب نہ تھا
درد و غم فکر و یاس ناکامی ——— کوئی مشکل سا انتخاب نہ تھا
ٹوٹی کشتی کا دیکھنے والا ——— لبِ ساحل کوئی حباب نہ تھا
عمر گذری ہمیں دعا کرتے ——— التجا کا اثر جواب نہ تھا
گل چمن میں ہوا سے آ کھلے ——— کوئی غنچہ بھی بے نقاب نہ تھا

حُسنِ عریاں نہاں تھا جذبۂ دید — آنکھ کے سامنے حجاب نہ تھا
عشق نے ہم کو کر دیا رسوا — پردہ در عالمِ شباب نہ تھا

شوقِ رُخ بھی ادھر نہیں کرتے
میکدہ خانۂ خراب نہ تھا

۱۹۴۲ء

جلوہ گاہِ حسن میں میں ایک ہی بیگانہ تھا — تم نے دیوانہ بنایا میں کہاں دیوانہ تھا
وہ بھی کیا دن تھے فریبِ حسن سے بیگانہ تھا — بے خبر تھا میں غمِ دنیا و مافیہا نہ تھا
یاد ہیں وہ دن کہ دورِ لغزشِ پیمانہ تھا — ساغرِ لبریز محوِ گردشِ مستانہ تھا
ساغر و صہبا و ساقی شیشہ و پیمانہ تھا — جس طرف اٹھی نظر میخانہ ہی میخانہ تھا
قلقلِ مینا سے سُننے نغمۂ منصور کیا — سوز و سازِ عشق سے جب تک کہ وہ بیگانہ تھا
بادۂ غفلت تو ہم نے ساقیا مانگی نہ تھی — جس کی تو نے دی پلائی کونسا میخانہ تھا
یاد اگر ہوتا تو کہتے ماجرائے دردِ دل — دامنِ مژگانِ رنگیں سُرخیِ افسانہ تھا
یوں تو دیکھے اور بھی دیوانے محوِ بیخودی — ہوش کی دنیا سے باہر آپ کا دیوانہ تھا
کارواں سے چھٹ گیا اک رہروِ راہِ طلب — دو قدم کچھ اور بڑھنا ہمتِ مردانہ تھا
زندگی موہوم تھی اور داستانِ غم طویل — مختصر کرنا تھا مشکل اپنا ہی افسانہ تھا
شمع کی فطرت یہ تھی جلتی رہے جلتی رہے — اور جل کر خاک ہو یہ مقصدِ پروانہ تھا

کچھ نہ پوچھو وجہ تسکینِ دلِ شوریدہ شوق
کچھ سکوں جس نے دیا وہ جلوہ بتخانہ تھا

سنہ ۱۹۴۲ء

دَرد کا سینہ میں گھٹ گھٹ کے پریشاں ہونا — کبھی اُٹھ اُٹھ کے مرے دل میں نمایاں ہونا
عشق کے پردے میں در پردہ نمایاں ہونا — حسن کا جلوہ گہِ ناز میں عریاں ہونا
روح کا قید سے گھبرا کے گریزاں ہونا — اور پھر حسنِ مجازی میں نمایاں ہونا
اپنے نزدیک برابر ہیں وجود اور عدم — راس آیا نہ ہمیں پیکرِ انساں ہونا
اُف رے وہ جوشِ بہار اُف رے فرا وانیِ حسن — اُف رے اے ذوقِ نظر تنگیِ داماں ہونا
چھُٹ گئے ہائے نشیمن سے اسیرانِ چمن — اُنکی تقدیر میں تھا داخلِ زنداں ہونا
فطرتِ حسن نہیں یہ کہ رہے زیرِ نقاب — شعلۂ شمع سے وہ سیکھ لے عریاں ہونا
دل بھر آتا ہی ٹپک پڑتے ہیں ٹپ ٹپ آنسو — ہے قیامت کسی مجبور کا گریاں ہونا
ایسا مشکل تو نہ تھا مسئلۂ مرگ و حیات — ہوتا دشوار اگر چاہتے آساں ہونا
دل میں پھر چین سے ارمان و تمنا رہتے — کاش آتا ہمیں بیگانۂ حرماں ہونا
کثرتِ جلوہ سے آخر یہ بھرم کھل ہی گیا — دل سے کہتے تھے نہ آئینۂ امکاں ہونا
ماہ و خورشید ہوں یا چرخِ بریں کے انجم — سب نے سیکھا ہے ترے حسن سے رخشاں ہونا
شوق سے نغمۂ دیوانہ اگر سنتا ہے — اے جنوں زخمہ زنِ تارِ رگِ جاں ہونا
باغباں دیکھنا حسرت سے ہی کیا غنچوں کو — فطرتِ گل ہے یونہیں چاکِ گریباں ہونا

اختراعاتِ جدیدہ سے ہی اُردو نالاں
اس نئے رنگ میں مشکل ہی سخنداں ہونا

ہمصفیرانِ چمن نغمے سنائیں گے کیسے
کہ خزاں آتے ہی گلشن ہے بیاباں ہونا

وہ ستم اہلِ وفا پر وہ جفائیں اے شوق
وہ ادا اُسکی کہ خود کردہ پشیماں ہونا

سنہ ۱۹۴۲ء

دل تھا وفا شعار اسی کو بھلا دیا
اف رے ستم کہ اس کو ہمیں نے مٹا دیا

نغمے نے آج صبح کے کیا کیا مزہ دیا
سر خفتگانِ عشق کو آخر جگا دیا

تھا شوقِ دید جذبۂ بے اختیار نے
آخر حریم ناز کا پردہ اٹھا دیا

نقش و نگار دہر کا منظر تھا دلفریب
سکہ اُسی کا عشق نے دل پر بٹھا دیا

بس ایک اُسی کی یاد رہی تھی حدیثِ عشق
یہ کیا کیا کہ تم نے مرا دل دکھا دیا

وہ لن ترانیاں تھیں کہ ہم سا نہیں کوئی
خود ان کا آئینہ انھیں لاکر دکھا دیا

ذراتِ منتشر کی ضیا پاشیاں نہ پوچھ
کچھ تو سمجھ کے اُن کو دل اپنا بنا دیا

رعنائیاں وہ حسن کی وہ سادہ کاریاں
آخر کو عشق نے بھی سر اپنا جھکا دیا

جلتی تھی دیکھ دیکھ کے دل سوزیاں مری
اچھا کیا کہ شمع کو تم نے بجھا دیا

اے جانے والو چل دئیے تم چھوڑ کر ہمیں
آخر فنا کا راستہ کس نے بتا دیا

امیدِ مغفرت تھی چلے جب یہاں سے ہم
کچھ بھی نہ کام آیا یہاں کا لیا دیا

وہ پچھلی باتیں یاد دلا کر انھوں نے شوق
لیں چٹکیاں کچھ ایسی کہ مجکو رُلا دیا

سنہ ۱۹۴۲ء

یہ وہ دل ہے کہ جو منت کشِ درماں نہیں ہوتا
ہزاروں ہوں ستم اس پہ کبھی نالاں نہیں ہوتا

یہاں تک ننگِ عریانی ہے دامن گیرِ وحشت میں
کہ ثابت جامۂ تن میں کبھی داماں نہیں ہوتا

ہماری خاک کے ذرّے بھی رہتے ہیں جدا ہم سے
یہ شانِ بے نیازی ہے کوئی ساماں نہیں ہوتا

نگاہِ شوق رہ جاتی ہے جلتے جاتے پردے پر
مگر حسنِ پسِ پردہ کبھی پنہاں نہیں ہوتا

مریضِ عشق کی واماندگی اب پوچھتے کیا ہو
کہ سب اٹھے یہ کہہ کر موت کا درماں نہیں ہوتا

خیالی صورتوں سے جب بہلتا ہے دلِ محزوں
مری مشقِ تصور کا کوئی پایاں نہیں ہوتا

بتا اے چارہ سازِ دل یہ آخر بیکسی کب تک
جو دل کو دل بنا دے ایسا کیا ساماں نہیں ہوتا

نہ پوچھو انتہائے صبر نے کیا کیا دکھایا ہے
وہی دل ہے کہ اب جس میں کوئی ارماں نہیں ہوتا

ہزار دل نقش ہیں جلوہ نما آئینۂ دل میں
مگر حیرت سی حیرت ہے کہ میں حیراں نہیں ہوتا

یہ کس دھوکے میں آکر روح آئی جسم خاکی میں
وگرنہ خود تو کوئی داخلِ زنداں نہیں ہوتا

نہ جب تک ٹھیس لگتی ہو دلِ پُر درد کو اے شوق
نمایاں اشک کا قطرہ سرِ مژگاں نہیں ہوتا

سنہ ۱۹۲۱ء

زمانہ نقش و نگارِ طلسم و خواب ہوا
عجب جہانِ تلوّن میں انقلاب ہوا

کسی کا حسن نہ پردے میں چھپ سکا آخر
نگاہِ شوق سے تنگ آ کے بے حجاب ہوا

یہ دل ہی تھا نہ کبھی جسنے اپنی خو بدلی
ہزار بار زمانے کو انقلاب ہوا

چمک کے برق نے کچھ ایسی چھیڑ کی دل سے
سنبھالا لاکھ مگر وقفِ اضطراب ہوا

بھلا ہو پیرِ مغاں میکدہ رہے آباد
ہمیں نصیب نہ اک ساغرِ شراب ہوا

کسی کی تیغِ ادا بن کے موجِ بحر اٹھی
سپر بدوش سنبھل کر ہر اک حباب ہوا

وفورِ ضبط نے پاسِ وفا کی رکھ لی شرم
ستم ہے اس پہ بھی میں موردِ عتاب ہوا

جو پہنچے منزلِ مقصود تک تھکے ماندے
مسافرانِ عدم کو خیالِ خواب ہوا

ہزار دل نقشِ کفِ پا سے جہاں میں مگر
ابھر کے ڈوبنے کو کاسۂ حباب ہوا

سمجھ کے دوستِ ازل میں لیا تھا جسکو
وہی تو دشمنِ جاں خانماں خراب ہوا

ہمارے دل سے کوئی کیفِ بیخودی پوچھے — جب آنکھیں کھولنا چاہیں ہجومِ خواب ہوا
نگاہ ساقی کی پھرتے ہی دور میں اے شوق
ہمارا جام ہی کاسۂ حباب ہوا

۱۹۴۳ء

چاکِ داماں کردیا ٹکڑے گریباں کر دیا — اے مرے اللہ کیا کیا سازو ساماں کردیا
مرحبا اے قوتِ احساس کیا کہنا ترا — دردِ دل کو بے نیازِ فکرِ درماں کردیا
بڑھتے بڑھتے کیوں ٹھٹک کر رہ گیا منزل کے پاس — اس طرح مجبور تجھکو کس نے ناداں کردیا
دیکھئے بے مائیگیٔ چشمِ گریاں دیکھئے — چند بوندیں تھیں انھیں کو زیبِ داماں کردیا
شمعِ محفل جا چھپی تھی پردۂ فانوس میں — شعلۂ لرزاں نے لیکن اسکو عریاں کردیا
قلقلِ مینا نے جھک کر ایسی کچھ تلقین کی — بزمِ رنداں سے اٹھ آنا جسنے آساں کردیا
دل بھڑکا اندر ہی اندر آتشِ خاموش سے — اسکے کہنے سے اُسی کو سوزِ پنہاں کردیا
رو رہے تھے بیٹھ کر صبحِ وطن کی یاد میں — تو نے آوارہ عبث شامِ غریباں کردیا
آرزو خواہش تمنّا سب کی سب رخصت ہوئیں — اضطرابِ دل نے کیا محشر بداماں کردیا
کون تھا جز اشک تمہیدِ بیانِ دردِ دل
عشق نے اے شوق اسکو زیبِ داماں کردیا

۱۹۴۴ء

سکونِ دل ہی ملا اور نہ غمگسار آیا — میں کس زبان سے کہدوں کہ ہاں قرار آیا

نہ بھولی یاد تیری ہم کو تا دمِ آخر — وہ تیرا نام تھا لب پر جو بار بار آیا

یہ کیوں ہی میکدہ خالی غضب ہوا ساقی — نہ دورِ ساغر و مینا نہ میگسار آیا

حیات و موت سے ہم بے خبر رہے برسوں — نہ آنا تھا نہ کبھی دل کو اعتبار آیا

یہ پاسِ وضع تھا وحشت میں پختہ کاروں کا — جنوں جنوں ہی رہا گو وہ بہار آیا

ترے کرم سے مجھے خوفِ معصیت نہ رہا — ترے حضور میں آخر میں شرمسار آیا

مآلِ دیدۂ شبنم بھی سب نے دیکھ لیا — چمن سے جو کوئی نکلا وہ اشکبار آیا

پلائی ساقی نے ایسی کہ سب کے ہوش اڑے — نہ میکدے سے کوئی رند ہوشیار آیا

وہ خاک ہو کے بنا گردِ کارواں آخر — کہاں کہاں سے بھٹکتا مرا غبار آیا

کہاں کی توبہ کہاں کا یہ زہد یہ تقویٰ — سنبھل کے شوق سے پیا موسمِ بہار آیا

کسی کا جلوہ نما دل کا آئینہ ہوتا — مگر وہ سوزِ محبت سے داغدار آیا

بچا سکے نہ گریباں کو دستِ وحشت سے — پڑا جو ہاتھ ہمیں دامن وہ تار تار آیا

ربابِ عشق کے نغمے ہزار بار سنے — مگر یہ ساز ہمیں تو نہ سازگار آیا

بجز کدورت کے بتا شوق کیا ہوا حاصل
یہ کس کے برتے پہ پھر تو امیدوار آیا

سنہ ۱۹۴۴ء

عشق میں اے جنوں نواز وحشتِ دل بڑھائے جا
شوق ہو مستِ بیخودی ایسی نوا سنائے جا

تنے کہیں نہ جاگ اٹھیں تھپکیوں سے سلائے جا
نیند کے ماتے سو گئے تو ہی انھیں جگائے جا

سازِ شکستہ پہ نہ جا چھیڑ کے دیکھ تو سہی
نغمے اِسی کے نو بہ نو نغمہ سرا سُنائے جا

شیشۂ دل کی خیر ہو ٹھیس لگی ہے ناصحا
رونے کو جی ہے چاہتا خوب ہمیں رلائے جا

چشم بھی خوں فشاں نہیں دامن بھی خشک ہو
دل میں لگی ہے آگ سی اس کو ذرا بجھائے جا

س کی خلش میں تھا مزہ رہتے تھے ہم بھی مطمئن
جانے وہ درد کیا ہوا تو ہی اُسے اٹھائے جا

شکوں کو دیکھ ضبط کر آنکھیں انھیں بہانہ دیں
دولتِ لازوال ہے یوں نہ اِسے لٹائے جا

داغِ جبیں نہ کھول دے رازِ سجودِ انکسار
یہ تو ہے ننگِ معصیت تجھسے مٹے مٹائے جا

منزلِ عشق اور ہم راہ نما کوئی نہیں
پاؤں نہ ڈگمگانے پائیں ہمتِ دل بڑھائے جا

جانا تھا جس کو چل دئے کچھ نہ کہا نہ کچھ سنا

بھول گئے تجھے وہ سب تو بھی انھیں بھلائے

عشق میں خوگرِ جفا شوقؔ رہا ہے مدتوں

شانِ ستمگری یہ ہے تو بھی ذرا لگائے جا

سنہ ۱۹۴۵ء

میں وہاں ہوں کہ جہاں حشر بپا کیا ہوگا
غمِ امروز نہ اندیشۂ فردا ہو

حد سے بڑھ جائیگا جب جوشِ جنوں کیا ہوگا
دستِ وحشت میں مرے دامنِ صحرا ہو

منتظر ہوں کہ ذرا رنگِ طبیعت بدلے
پھر وہی جوشِ جنوں پھر وہی سودا ہو

بادہ کش محفلِ ساقی سے اٹھے جاتے ہیں
اب نہ ساغر نہ صراحی نہ وہ مینا ہو

غیر ممکن ہے کہ مٹ جائے خیالی دنیا
سر اگر ہوگا تو سر میں ترا سودا ہو

دور سے منظرِ ساحل تو نظر آتا ہے
ڈوبنے والے کو کیا اور سہارا ہو

پوچھتے کیا ہو کدھر جاتے ہیں جانیوالے
پھر دریا پہ ان کا کبھی پھیرا ہو

بیخودی میں ہمیں آ گے کی خبر کچھ بھی نہیں
ہم کہاں اور کہاں یہ دلِ رسوا ہو

یہ غلط ہے کہ تصور میں ہے جلوؤں کی کمی
اے نظر دیکھنا حائل کوئی پردا ہو

کاش للچائی نگاہوں سے وہ دیکھیں اے شوقؔ

بات کرتے دلِ شوریدہ کا سودا ہوگا

سنہ ۱۹۴۵ء

دستِ وحشت جو بڑھا تارِ گریباں نہ ملا
ایک ٹانکا بھی تو وابستہ داماں نہ ملا

تابِ دیدار کبھی اہلِ نظر کیا لاتے — حسن وہ حسن جو پردے میں بھی عریاں نہ ملا
یوں تو گلزار میں ہر پھول کو دیکھا لیکن — دیکھنے والا ترا نرگسِ حیراں نہ ملا
دیکھ تو لیتی ذرا دل میں ہجومِ ارماں — ایک لمحہ بھی تجھے عمرِ گریزاں نہ ملا
جب چھٹے قیدِ قفس سے تو ہوا یہ عالم — نہ ملا اپنا نشیمن وہ گلستاں نہ ملا
ہم تو پاتے لبِ ہر زخم نہاں کو لیکن — ٹانکا دینے کو کوئی تارِ رگِ جاں نہ ملا
دردِ دل سوزِ جگر آتشِ غم داغِ فراق — ہم کو آزاد کا اپنے کوئی درماں نہ ملا
ٹمٹماتا ہوا تھا اپنا چراغِ ہستی — دیکھتے دیکھتے وہ بھی تہِ داماں نہ ملا

منہ ہی تکتے رہے قسّامِ ازل کا اے شوق
اپنی قسمت سے وہاں بھی کوئی ساماں نہ ملا

سنہ ۱۹۴۵ء

آئے دن عشق و محبت میں یہ جھگڑا کیسا — فکرِ امروز ہے کیا کم غمِ فردا کیسا
آہ کیا سینے سے نکلی کہ ملا دل کو سکوں — ہاتھ آہی گیا سستا سا یہ سودا کیسا
مرحبا ڈھونڈنے والو تھیں ہم یاد تو ہیں — ورنہ دل والوں میں بیدل کا یہ چرچا کیسا
پہلے تو سازِ شکستہ کی صدا آتی تھی — اب اسی ساز کا سنتا ہوں کہ نغمہ کیسا
شکلِ امید بگڑتی جو نظر آتی ہے — پوچھ لیتا ہوں کہ میں دل سے کہ رونا کیسا
مل گئی اوجِ فلک پر اسے ہر پھر کے جگہ — مل گیا میرے تصور کو ٹھکانا کیسا
دلِ پامال کا خاکہ کوئی کیونکر کھینچے — خیف بن بن کے بگڑ جاتا ہی نقشہ کیسا

عمر بھر دردِ محبت ہی رہا ہی ہمدرد
چارہ گر ہوش کی لے دل کا مداوا کیسا

تھا کبھی ناز ہمیں عجز و نیازِ دل پر
اب وہ کہتے ہیں نہیں ہی تو یہ سجدہ کیسا

سالکِ راہ طلب کہتے ہیں تمکو اے شوقؔ
ایسے بہکے ہوئے لوگوں کا سہارا کیسا

سنہ ۱۹۴۵ء

کام آنا تھا دلِ وارفتہ کام آہی گیا
اسکے مٹتے ہی کسی کافر کا نام آہی گیا

اب سکوں سے ہے کام لیں وقتِ قیام آہی گیا
ڈھونڈتے پھرتے تھے جسکو وہ مقام آہی گیا

میٹھی نیندیں سو رہے تھے خفتگانِ معصیت
اب جگانے کو کوئی محشر خرام آہی گیا

رائیگاں کی عمر ساری سعیٔ لاحاصل ہی حیف
منتظر تھے جسکے آخر وہ پیام آہی گیا

جس کو دیکھو میکدے میں ہی دستہ خمخانہ بردوش
تشنہ کاموں ہوش کی لو دورِ جام آہی گیا

وادیٔ جنت ہوا خوفِ جہنم اب نہیں
آخری ہچکی میں لب پر اس کا نام آہی گیا

کہتے کہتے رک گئے تھے واقعاتِ رنج و غم
آج لب پر پھر وہ ذکرِ ناتمام آہی گیا

توبہ کرنے پر طبیعت میری آمادہ نہ تھی
میکشو اب کیا کروں ماہِ صیام آہی گیا

احترامِ میکدہ میں جام ہم نے رکھ دیا
اک بھری محفل میں جب ساقی کا نام آہی گیا

مجمعِ رنداں میں ساقی کا یہ کہنا شوق سے
دادِ میخانہ اب ہو تشنہ کام آہی گیا

ہم نشینوں جب کبھی جا بیٹھے بزمِ شوق میں
باتوں باتوں میں ہمیں لطفِ کلام آہی گیا

۱۹۴۵ء

چلتی پھرتی نگاہ نے مارا اُس قیامت پناہ نے مارا

سیدھے تیروں کو رکھ لیا دلیں ایک ترچھی نگاہ نے مارا

دیکھتے کیا ہو چرخ کے تارو گردشِ بے پناہ نے مارا

زندگی اور بندگی گذری اُلٹے سیدھے نباہ نے مارا

رہ کے دُنیا میں اور کیا ملتا فکرِ شام و پگاہ نے مارا

این و آں سے تھا بے خبر لیکن خوفِ بارِ گناہ نے مارا

بے خبر ہم تھے دل کی سازش سے آپ کی رسم و راہ نے مارا

بزمِ شعراء میں شورِ تحسیں ہے آپ کی واہ واہ نے مارا

سحرِ کامل کے دم میں آہی گئے ہم کو جادو نگاہ نے مارا

غم وحرماں کا نام کیا لیتے ہم کو بختِ سیاہ نے مارا

کچھ زباں سے تو کہیئے حضرتِ شوقؔ

کون تھا کس کی چاہ نے مارا

زباں دراز ہیئے سوسن بھی کچھ نہیں چلتی خموش پھولوں کا حسنِ بیاں نہیں ملتا

یہ ان کا رازِ خموشی بھی اک معمہ ہے خموش پھولوں کا حسنِ بیاں نہیں ملتا

کوئی تو بات ہے ایسی کہ جس سے ہے یہ سکوت ایضاً

کسی نے ان کو چمن میں بھی بولتے نہ سُنا خموش پھولوں کا حسُن بیاں نہیں ملتا

تمام عمر یہ گلچیں کو ہم نے کہتے سُنا ایضاً

صبا سے پوچھو تو کیا اُس نے کہدیا اُسنے "

چمن میں کانوں پہ سوسن بھی ہاتھ دھرتی ہے "

سنہ ۱۹۴۵ء

دعائیں خاک مانگوں اے دلِ ناداں سحر ہو کر

نہیں جاتیں نہیں پھرتیں وہ پابندِ اثر ہو کر

گناہیں ڈھونڈتی ہیں جلوہ زارِ حُسن کو برسوں

بدل دی دل کی دنیا تم نے نیرنگِ نظر ہو کر

دلِ سودا زدہ سے پوچھتے ہم گر کہیں ملتا

بھٹکتا پھر رہا ہے کس لئے شوریدہ سر ہو کر

قفس میں چار تنکے لادیئے صیاد نے لیکن

بنائے آشیاں ڈالیں کہاں بے بال و پر ہو کر

نغانِ گرم سے چنگاریاں اٹھتی ہیں رہ رہ کر

نکل جائے کہیں لب سے نہ آہِ بے اثر ہو کر

کچھ ایسا راس آیا دل کو وہ سوزِ غمِ الفت

کہ سینے میں رہا آخر وہی جز و جگر ہو کر

…اں یہ چشمِ ظاہر بیں کہاں وہ جلوؤں کی کثرت
حریمِ ناز سے پلٹا ہوں مایوسِ نظر ہو کر
تمیزِ نیک و بد اے شوق دیکھو تم کو لازم ہے
تعجب ہے بنے انجان تم اہلِ نظر ہو کر

سنہ ۱۹۴۵ء

…چبھن ہے دل میں یادِ مسیحا کئے بغیر
دو بھر ہے زندگی بھی مداوا کئے بغیر

…ب انتہائے جوش میں کچھ ہوش ہی نہیں
دل دے رہا ہوں آپ کو سودا کئے بغیر

…م لاکھ پردہ پوش ہوں لیکن جنونِ عشق
دل مانتا ہی کب ہے تجھے رسوا کئے بغیر

…ہ رہ کے سوچتے ہیں ہم انجامِ کار کو
دل لے کے جا رہے ہیں ٹھکانا کئے بغیر

…ے چشمِ شوق تو ہی بتا دیکھ بھال کر
پیشِ نظر ہے کون یہ پردا کئے بغیر

…ن لیجئے کہ کہتی ہیں کیا بیقراریاں
بنتی نہیں ہے عرضِ تمنا کئے بغیر

…ہ کیا ہوا ہے اے دلِ ناکامِ آرزو
کیوں رو رہا ہے غم کو شناسا کئے بغیر

…ں کر دیئے الست بسر کی تمام عمر
مینا و جام و بادہ کی پروا کئے بغیر

…ل چاہتا ہے تکملۂ ذوقِ معصیت
ممکن نہیں یہ الفتِ دنیا کئے بغیر

…ر مستِ نازِ حسن کی وہ جلوہ ریزیاں
آنکھیں جھپک رہی ہیں نظارا کئے بغیر

…یں سے غرض نہیں ہے کہ انجام کچھ بھی ہو
دل مانتا نہیں ہے نظارا کئے بغیر

…ب ناخدا ہے اور ہے موجوں کی سرکشی
ساحل چھٹا ہے مجھ سے ارادا کئے بغیر

کیا اعتبارِ شوقِ دلِ بیقرار کا
رہتا نہو جو ہجر میں نالا کئے بغیر

۱۹۴۴ء

رہ چکے ہیں ایک مدت دل سے بیگانے کے پاس
اب دھر آگیا ہے کہ جائیں ایسے دیوانے کے پاس

دل کی خواہش تھی کہ رہتا اپنے کاشانے کے پاس
جوشِ وحشت لے ہی آیا اسکو ویرانے کے پاس

کیا کہیں ہم بادۂ عرفاں کہیں ملتی نہیں
ساقیا دیں گے دہائی اب ترے میخانے کے پاس

اک جنونِ بیخودی اور وہ تجلیاں بکھری ہوئی
اور کیا ساماں ہے بیگانے ترے دیوانے کے پاس

مجلسِ رنداں ہوئی ہے مدتوں میں آج گرم
جشنِ نو آؤ منائیں اپنے میخانے کے پاس

خانقاہیں دیکھ لیں دیر و حرم دیکھے مگر
اب نیا معبد بنائیں گے صنم خانے کے پاس

سوز ہے دونوں میں یکساں ساز بھی دونوں میں ہے
رہنے بھی دے اپنے دیوانے کو پروانے کے پاس

تشنہ لب ہوں ساقیا جی بھر کے پینے دے مجھے
شیشۂ مئے بھر کے رکھدے آ کے پیمانے کے پاس

تلخ کامی نامرادی آئیں تو آنے بھی دو
ہے سکوتِ یاس ہر دم دل کے غمخانے کے پاس

خوب گذریگی اگر دیوانے آ کر بس گئے
چاہئے اک اور ویرانہ ہو ویرانے کے پاس

ایک عالم میں گذر جاتے ہیں اسکو رات دن
بیخودی سی بیخودی رہتی ہے دیوانے کے پاس

المدد اے جذبِ الفت المدد اے سوزِ عشق
شمع روشن کر دے آ کر تو دل کے ویرانے کے پاس

کب تہ نے کب گئے اُن کی دفورِ بیخودی
کب سے وہ جلوہ فگن ہے آئینہ خانے کے پاس

خوب گذریگی اگر دیوانے آ کر بس گئے
چاہئے اک انکی بستی اپنے ویرانے کے پاس

اُسکو سنکر اور دیوانے بھڑک اٹھینگے شوق
شورِ محشر رہنے دے بچے اپنے ویرانے کے پاس

۱۹۴۴ء

وہ میری ناصیہ سائی تھی وہ بتخانۂ عشق — ختم ہونا ہی یہیں پر مرا افسانۂ عشق
پھر جو مانگوں تو نہ دینا مجھے صہبا کی قسم — دے بھی دے شوق سے ساقی مجھے پیمانۂ عشق
کچھ ازل سے نہ ملا لاکھ میں مانگا ہی کیا — اپنی قسمت سے ملا ہے یہی افسانۂ عشق
جذبِ کامل ترا تکمیل کا دعوے کیسا — بات تو جب ہے کہ ہو جاؤں میں بیگانۂ عشق
کاتبِ روزِ ازل مجھ سے جو پوچھے تو کہوں — یاد ہے یاد ہے مجکو وہی افسانۂ عشق
درحقیقت وہی عاقل وہی فرزانہ ہے — دل سے دیوانہ سمجھ لے کہ ہوں دیوانۂ عشق
آپ پچھتائیں نہیں سنکے مآلِ شبِ ہجر — حاصلِ زیست یہی ہے مرا افسانۂ عشق
ابتدا کی تو خبر خیر سے کچھ ہے معلوم — انتہا تک جو نہ پہنچا وہ ہے بیگانۂ عشق
منزلِ عشق ہے کچھ دور بظاہر لیکن — گھر ہے جسکی ہو ہادی ہے وہ فرزانۂ عشق
ہم بھی جذباتِ محبت سے کبھی تھے مجبور — ایک عالم تھا سنا کرتے تھے افسانۂ عشق
ایک ہی شمع تھی جس سے کہ لگائی لو تھی — بن گیا ہوں میں اُسی کیف سے پروانۂ عشق
ایک زمانہ ہوا ہر رنگ بدلتے دل کو — میں کجا اور کجا یہ تیرا کاشانۂ عشق
آستانے پہ مجھے کھینچ کے لائی تقدیر — ورنہ میں اور کہاں یہ تیرا کاشانۂ عشق

محبت ہے وہی اور جذبِ تصور ہے وہی
پھر بھی کہتے ہو کہ ہے شوق تو بیگانۂ عشق

۱۹۴۱ء

رہی محدود سرگرمی تلاشِ ساز و ساماں تک
نہ پہونچی ہمت جوشِ جنوں شامِ غریباں تک

اٹھائے تھے قدم ہمت نے گر اے وائے نادانی
سمٹ کر رہ گئے آخر وہ دامانِ بیاباں تک

بہت کچھ ناز اے دستِ جنوں جامہ دری پر تھا
بتا تو یہ کیا کس نے رفو چاکِ گریباں تک

ابھارا جوشِ وحشت نے جنونِ فتنہ پرور کو
مگر وہ رہ گیا بڑھ کر حدِ چاکِ داماں تک

نظر آیا نہ وہ جلوہ تماشا گاہِ عالم میں
کہ جسکی جستجو کی ہم نے برسوں حدِ امکاں تک

میری دیوانگی کچھ کم نہیں ہے ہوشیاری میں
نہ پہونچیگا مرا ہاتھ اے جنوں چاکِ گریباں تک

یہیں ہم حشر کر دیتے بپا پہلے قیامت سے
پہنچتی گر صدا دل کی جنونِ فتنہ ساماں تک

کمالِ ضبط کہتے ہیں اسے دنیائے الفت میں
خموشی کا ہے عالم دیکھئے شہرِ خموشاں تک

یہ کیسا جوشِ وحشت ہے تمکو ناز تھا اے شوق
ابھی تک چاکِ دامانی نہیں پہونچی گریباں تک

دیکھئے آہ کی تاثیر اثر ہونے تک
یہ تو ظاہر ہے کہ کیا ہوگا سحر ہونے تک

شوق نظارۂ عالم کی نہ پروا کیجئے
دھیان دیجئے نہ ابھی ترکِ قمر ہونے تک

شمع کو رونے دو جلنے دو کسی کے غم میں
دل بھی سہہ لیگا جو گذریگی سحر ہونے تک

بیٹھے بیٹھے کچھ دل کو سکوں ہو جائے
ٹھہرے ٹھہرے کچھ حالِ جگر ہونے تک

آہ تو کھینچتے ہیں دیکھنا اے چرخ مگر
رنگ کیا لائے خدا جانے اثر ہونے تک

آؤ جانے دو زمانے کو سناتے کیا ہو
بات بڑھ جائیگی دنیا کو خبر ہونے تک

آپ کب تک نہ سنیں گے دلِ محزوں کی صدا
ہم بھی کہہ لینگے جو کہنا ہے سحر ہونے تک

دیکھ لیجئیگا کہ بیتاب تڑپتے کیوں ہیں
آپ رک جائیں ذرا دردِ جگر ہونے تک

ظلمتِ شب ہے انیسِ غمِ ہجراں اے شوق
اس سے کہدو کہ ٹھہر جائے سحر ہونے تک

سنہ ١٩٤٤ء

کیا رنگ لائے دیکھئے سودائے خامِ دل
بگڑا ہوا ہے سلسلۂ انتظامِ دل

عاجز ہے فہم عقل کا ممکن نہیں گذر
برتر خیال و وہم و گماں سے ہے بامِ دل

چھائی گھٹا ہے چار طرف ابر ہے محیط
صبحِ بہار ہے کہ سویدائے شامِ دل

گویا زباں کے لطف سے واقف نہیں کوئی
پڑھتا ہے سارا شہر خموشاں کلامِ دل

دیکھا نہیں ہے آنکھوں سے ہمنے اسے مگر
مخلوق کی زبان سے سنتے ہیں نامِ دل

ہر لحظہ بے قرار ہے بیتاب ہر گھڑی
اک اضطراب میں ہے سکونِ قیامِ دل

ممکن نہیں ہے نالۂ خاموش کا گذر
پہونچائیں بزمِ ناز میں کیونکر پیامِ دل

خالی نہ ذوق بادۂ سرجوش سے رہا
کیفِ مئے الست سے مملو ہے جامِ دل

دنیا سے بے غرض رہا اور دیں سے بیخبر
نکلا نہ حسن و عشق سے افسوس کامِ دل

کیا کیا نہ ظلم ڈھائے بتوں نے زمانے میں
کس کس سے شوقؔ لیجئے اب انتقامِ دل

۱۹۴۰ء

انجامِ کار یہ دلِ ناداں ہے اور ہم
اے شوق تیرا جذب نمایاں ہے اور ہم

دردِ درون و دیدۂ گریاں ہے اور ہم
داغ بتا کہ تنگیٔ داماں ہے اور ہم

موجِ نسیم، سبزۂ گل، نغمۂ ہزار
رنگینیٔ بہارِ گلستاں ہے اور ہم

امید و بیم میں بسر ہو جائے گی یہ رات
تیرا خیال و خوابِ پریشاں ہے اور ہم

دل میں رہے نہ حسرت و ارماں نہ آرزو
سازِ جنونِ بے سر و ساماں ہے اور ہم

موجِ نسیم! ہجر زدہ کو نہ چھیڑنا
امڈا ہے دل۔ تہیۂ طوفاں ہے اور ہم

جلوت میں بھی مجالِ شکایت نہیں رہی
نیچی نظر ہے کوئی پشیماں ہے اور ہم

چھائی ہوئی ہیں حسن کی رعنائیاں تمام
کوتہ نظر ہے۔ پردۂ امکاں ہے اور ہم

پیشِ نظر ہے دور سے آئینۂ جمال
پہلو میں دل ہے۔ دیدۂ حیراں ہے اور ہم

دامن نہیں کہ رکھ لیں انھیں بھی سمیٹ کر
ذرّے ہیں اور خاکِ پریشاں ہے اور ہم

چاہا تھا یہ کہ زینتِ داماں ہو لختِ دل
بد قسمتی سے دامنِ مژگاں ہے اور ہم

ہاں ایک وار اور ہو اوچھا ہی وہ سہی
خنداں ہیں زخم خالی نمکداں ہے اور ہم

مجبور کر دیا دلِ ہنگامہ خیز نے
وہ بھی ہے شوقؔ دورِ حریفاں ہے اور ہم

۱۹۴۱ء

واقفِ رازِ محبت ہوش سے بیگانہ ہم
سجدہ گاہِ کعبہ ہم سنگِ درِ بتخانہ ہم

رندِ مئے آشام ہم - زینت دہِ میخانہ ہم
شیشہ و جام و سبو و ساغر و پیمانہ ہم

جامِ صہبا چھین کر ساقی سے بیباکانہ ہم
کھینچ لائے موجِ مئے تا لبِ پیمانہ ہم

میکدہ ہم نے بسایا جام و مینا ہم بنے
تشنۂ صہبائے غفلت لغزشِ مستانہ ہم

بیخودی! وارفتگی کی انتہا اتنی تو ہو
بارگاہِ ناز میں ہیں صورتِ دیوانہ ہم

رازِ ہستی و عدم - عالم میں آکر کھل گیا
عقل ہوتی تو چلے آتے نہ بیباکانہ ہم

وائے ناکامی مقدر سے نہ ہاتھ آیا کبھی
مانگتے ہی رہ گئے ساقی سے اک پیمانہ ہم

آستانہ ایک ہی اب چھوڑ کر جائیں کہاں
حضرتِ دل! ہیں ازل سے ساجدِ بتخانہ ہم

چُلّوؤں سے سیر ہوتے ہیں کہیں مستِ الست
ساقیا رکھے ہوئے ہیں دوش پر خمخانہ ہم

بارگاہِ ناز میں ہیں پردۂ سوز و گداز
بزم میں ہیں یادگارِ شمع و پروانہ ہم

ہمنشیں کیا پوچھتا ہے رمزِ دورِ میکشی
آ تجھے، چل کر دکھائیں صحبتِ رندانہ ہم

جاں نثارِ شمعِ محفل یادگارِ سوز و ساز
ڈھونڈ کر لائے ہیں مٹھی بھر پر پروانہ ہم

نیچی نظروں سے ہمیں ساقی نے دیکھا دور میں
میکشو اس کو بھی سمجھے لغزشِ مستانہ ہم

حشر میں کیا جانے کس افتاد کا ہو سامنا
دردِ دل کا شوق چھوڑیں گے یہیں افسانہ ہم

۱۹۴۳ء

شوقِ رہبر تھا یہ چھپ کے پردۂ حائل سے ہم
آستانِ حسن پر لو آ گئے ساحل سے ہم

بیخودی سے ہوش میں آئے بڑی مشکل سے ہم
ہو گئے رکھتے ہی ہوش سے بیہوش اپنے دل سے ہم

امتحانِ ضبط تھا نذرِ ہنگامِ قتل
رل کے جب پلٹیں نگاہیں ہو گئے بسمل سے ہم

بے تحاشا اٹھ گئیں نظریں نجانے کسطرف
ہو گئے آئینۂ حق جلوۂ باطل سے ہم

کیا خبر یہ گمرہی لے جا کے چھوڑیگی کہاں
واسطہ ہی اب نہیں رکھتے کسی منزل سے ہم

ہو کے ناکامِ تمنا دل کی ہمت بڑھ گئی
عشق کی منزل تک آئے سعیٔ لاحاصل سے ہم

دیکھیں کیونکر ڈوبتی ہے ناخدا ہشیار باش
آج لیجاتے ہیں کشتی دور تر ساحل سے ہم

ہجر میں بھی کیا سکونِ قلب ہوتا ہے نصیب
عشق کی دنیا ہے اور ہیں حیزۂ لاحاصل سے ہم

بارگاہِ عشق کی ہے جستجو پیشِ نگاہ
ہو گئے بیگانہ آخر جادۂ منزل سے ہم

سایۂ شمشیر میں ہیں اک دم لینے تو دے
آخری فریاد سن لیں پھر لبِ ساحل سے ہم

کیا خبر تھی دلفریبِ حسن سے لائیگا رنگ
کاش ہوتے باخبر کچھ لیلیٰ محمل سے ہم

ڈوبنے والو پر کیا گذری محیطِ عشق میں
آیئے کچھ ماجرا سن لیں لبِ ساحل سے ہم

خاک ہی کیوں چھانتے برسوں بارِ عشق میں
کاش ہوتے باخبر کچھ لیلیٰ محمل سے ہم

دلنشیں ہوتے ہوئے دیکھے سفینے جبکہ شوق
بے نیازانہ اٹھے آخر لبِ ساحل سے ہم

۱۹۴۱ء

جامِ صہبا چھین کر ساقی سے بیباکانہ ہم
کھینچ لائے موجِ مے کو تا لبِ پیمانہ ہم

شیشہ و ساغر بھرے رہتے ہیں بزمِ ناز میں — دیکھنے آئے ہیں ساقی گردشِ پیمانہ ہم

برہمیٔ جوشِ وحشت ہے کہ تکمیلِ جنوں — آتے آتے راہ پر پھر ہو گئے دیوانہ ہم

جذبۂ وارفتگی تھا یا کہ ساقی کی کشش — بیخودی میں آ گئے خود تا درِ میخانہ ہم

کثرتِ جذبات سے دل کو نہ یکسو کر سکے — خود ہی سنبھلے دیکھ کر وہ جلوۂ جانانہ ہم

ہو سکے ہم سے نہ یکسو کثرتِ جذباتِ عشق — بارگاہِ ناز میں آخر رہے بیگانہ ہم

گرمیٔ حسنِ نقابی کا اثر کیا خاک ہو — لائے ہیں دل میں ازل سے سوزشِ پروانہ ہم

اُف ری بیتابی کہیں کا بھی نہ رکھا عشق نے — خوب شد۔ دونوں جہاں سے ہو گئے بیگانہ ہم

توبہ ہم کر لیں مگر دل کی اُمنگوں کا علاج
چھوڑ دیں لے شوق کیسے مشربِ رندانہ ہم

سنہ ۱۹۴۵ء

درد کو رہنے دو خود ہی درد بن جائیں گے ہم — آپ اُٹھتے ہیں گے تڑپ کر دل کو تڑپائیں گے ہم

آہیں بیکس جتنی وہ چاہیں گے بڑھائیں گے ہم — راہ پر ساقی کو اپنی اب لگا لائیں گے ہم

دل میں گو شکوے ہزاروں ہیں مگر خاموش ہیں — چھیڑنے کی دیر ہے دم بھر میں کھل جائیں گے ہم

رفتہ رفتہ بہ گئے وہ لختِ دل لختِ جگر — آنکھوں سے خوشرنگ آنسو خاک برسائیں گے ہم

نقشِ باطل دیکھ کر دل اور بھی خوش ہو گیا — نقشِ فطرت دیکھئے پھر اس کو شرمائیں گے ہم

پہلے سن لو اور اہلِ درد و غم کے واقعات — پھر ہم اپنی داستاں سے تم کو بہلائیں گے ہم

پردہ اُٹھتے ہی کسی کا حسنِ دلکش دیکھ کر — جلوہ گاہِ ناز میں تصویر بن جائیں گے ہم

خودسری سے بے نیازی ہوش سے بیگانگی ۔ محفلِ جاناں میں جاکر اور کیا پائیں گے ہم

بیخودی پہنچا بھی دے تو جلوہ گاہِ ناز تک ۔ دیکھ لیں گے جب اُٹھیں آپے میں آجائینگے ہم

ساز آیا گر نہ سازِ مطربِ نغمہ سرا ۔ اک نیا نغمہ پھر اپنے ساز پر گائینگے ہم

نقشِ رنگیں دیکھنے والے کو سمجھا دے کوئی ۔ عشق کامل میں یہی تصویر بن جائینگے ہم

ہے اگر کچھ ہمتِ پروازِ ادراک و خیال ۔ ایک دن تارے فلک سے توڑ کر لائینگے ہم

شوق اب جائیں کہاں یہ آستانہ چھوڑ کر
کس کے در پہ کس کے آگے ہاتھ پھیلائینگے ہم

۱۹۴۵ء

یہ پاسِ ضبط ہے رُخ سے کچھ آشکار نہیں ۔ ستم اٹھا کے بھی دل ہے کہ اشکبار نہیں

خطا پہ نازاں ہے دل اب بھی شرمسار نہیں ۔ ضیائے عشق اُسی سے تو جلوہ بار نہیں

خزاں نصیب ہیں گل نغمۂ ہزار نہیں ۔ یہ کیا ہوا کہ چمن میں وہ اب بہار نہیں

ہزار دل حسرت و ارماں تو دل میں اب بھی ہیں ۔ مگر نشان ہمارا تہِ مزار نہیں

سنیں سنیں نہ سنیں کہئے کیا کرے کوئی ۔ بیانِ دل میں مگر شکلِ اختصار نہیں

وہ بیخودی گئی سر سے نہ وہ خُمار گیا ۔ خیال توبہ مگر اب بھی مے گسار نہیں

نگاہِ مست ہو پھر میری سمت اے ساقی ۔ سرور کیا کہ ذرا بھی مجھے خمار نہیں

فضا ہے نور سے معمور رقص میں جلوے ۔ عجب سماں ہے کہ چشم ہوشیار نہیں

تمھاری جانے بلا کیا گذر گئی دل پر ۔ مٹا کے چھوڑ گئی اسکو یہ بار بار نہیں

یہ کون شہرِ خموشاں میں بول اٹھا کہ یہاں
ستم کے ماروں کی کوئی بھی یادگار نہیں

جنونِ عشق میں اٹھ کر کدھر چلے اے شوق
وہ جلوہ گاہ ہے تماشائے روزگار نہیں

۱۹۴۰ء

بہار آتے ہی میں رنگِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں
کبھی دامن کبھی جیب و گریباں دیکھ لیتا ہوں

تصور میں جمالِ روئے جاناں دیکھ لیتا ہوں
نگاہِ شوق کو میں گل بداماں دیکھ لیتا ہوں

کروں کیا امتیازِ جذبۂ الفت ہے ناممکن
دیارِ عشق میں گبر و مسلماں دیکھ لیتا ہوں

میری بیتابیٔ دل کا وہ عالم ہے معاذاللہ
کسی کی بزم میں جب شمع لرزاں دیکھ لیتا ہوں

گذر ہوتا ہے بھولے سے جو اُس جانب کبھی میرا
عجب عبرت سے میں شہرِ خموشاں دیکھ لیتا ہوں

مآلِ ہستیٔ فانی ارے توبہ ارے توبہ
بصد حسرت میں ذراتِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

چمن میں بھی سکونِ دل نہیں ملتا نہیں ملتا
بہ حسرت جب گلوں کو چاک داماں دیکھ لیتا ہوں

وفورِ گریہ ہی لذت کشِ آشفتہ سامانی
جب آنکھیں بند کیں خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

تصور میں بھی وحشت کارفرما ہوتی جاتی ہے
میں خود حیرت میں ہوں دنیا کو حیراں دیکھ لیتا ہوں

یہ محویت کا عالم ہے تصور میں میرے دل کا
کہ ہر شے میں نمایاں حسنِ عریاں دیکھ لیتا ہوں

مجالِ ضبط جب رہتی نہیں خوں بار آنکھوں میں
نگاہِ یاس سے تنگیٔ داماں دیکھ لیتا ہوں

مآلِ جذبِ الفت اور کیا اے شوق ہونا تھا
غنیمت ہے کہ اب دل کو پشیماں دیکھ لیتا ہوں

سنہ ١٩٤٢ء

فرق جو تھا وہ کھل گیا ناز میں اور نیاز میں
دونوں کا راز تھا نہاں پردۂ امتیاز میں

عشق نے سر جھکا دیا بارگہِ نیاز میں
جلوؤں کا اک ہجوم ہے آئینۂ مجاز میں

سازشِ حسن و عشق بھی خالی نہ تھی فریب سے
لائی ہمیں کشاں کشاں انجمنِ مجاز میں

خاک ہوا وہ سوختہ ختم ہوا وہ سوزِ شمع
دونوں یہ نام کر گئے محفلِ سوز و ساز میں

عشق سے اب یہ پوچھیے دل کو ہے اضطراب کیوں
چین تھا ملنا مل گیا دردِ سکوں نواز میں

منزلِ عشق دور تھی شوق یہ تھا چلے چلو
حد سے نہ آگے بڑھ سکے بارگہِ دراز میں

چھائی ہے دل پہ محویت ہوش و خرد ہوئے ہیں گم
دیکھی ہے اک ادائے خاص حسن ادا طراز میں

عجز و نیاز شوق نے اور بڑھا دیں ہمتیں
خوب پناہ مل گئی رحمتِ کارساز میں

سنہ ١٩٤٠ء

فسوں ہے یا کوئی اعجاز ہے شمشیرِ قاتل میں
کہ رہتا ہے اک اندازِ خموشی رقصِ بسمل میں

بتا دینا نہیں آساں کہ مخفی کیا ہے محمل میں
کشش جب تک نہ ہو پیدا کسی کے جذبِ کامل میں

پتہ ملتا تھا کچھ کچھ جن سے محرومیٔ قسمت کا
لکیریں بھی نظر آتی نہیں اب دستِ سائل میں

اسی مرکز پہ آئے گردشِ قسمت سے ہر پھر کر
عبث کی عمر ساری رائیگاں قطعِ منازل میں

نہ پوچھو کس غریقِ غم کی کشتی تہ نشیں ہوگی
تلاطم سا تلاطم آج ہے امواجِ ساحل میں

پڑے ایسے بھی ہیں زنداں میں ہنستے ہیں نہ روتے ہیں
اسی سے کچھ کمی سی ہو گئی شورِ سلاسل میں

مزہ کچھ آ ہی جاتا ہے لبوں تک جب نہ آتی ہے
اک ہلکی سی دبی فریاد رہتی ہے میرے دل میں

قدم رکھنے تو دو مجھکو ذرا صحرائے غربت میں
بتا دیں گے کہ یوں آسانیاں ہوتی ہیں مشکل میں

بڑھے دستِ طلب کیوں اور کیوں کم ظرف کہلائیں
ہزاروں نعمتیں موجود ہیں کشکولِ سائل میں

نجانے ساتھ کیونکر راہ روانِ عشق کا چھوٹا
کسی سے کم نہ تھے ہم گرم رفتاریٔ منزل میں

نہ شوقِ سجدہ ہی باقی نہ وہ ذوقِ جبیں سائی
نہ جانے یہ سمائی کیا ہے میرے منحرف دل میں

ہمیں کچھ جانتے ہیں لذتِ خارِ محبت کو
کہ اٹھتے بیٹھتے ہوتی ہے رہ رہ کر خلش دل میں

دلِ بیباک کو تم ساتھ لیکر کیوں چلے اے شوق
کہیں کچھ برہمی پیدا نہ ہو آدابِ محفل میں

۱۹۴۲ء

ظاہر ہوں مگر جلوۂ کثرت سے جدا ہوں
خود جلوہ ہوں اور پیکرِ خاکی میں چھپا ہوں

کہتا ہوں میں جب بندۂ تسلیم و رضا ہوں
کہتے ہیں اشاروں میں کہ پابندِ جفا ہوں

پروا نہیں اس کی کہ میں بے برگ و نوا ہوں
پھر بھی ہے مجھے ناز اسی در کا گدا ہوں

دنیائے تصور میں ہوں آئینۂ عالم
آئینۂ تمثال میں تصویرِ بقا ہوں

گمنام ہوں بدنام ہوں دیوانہ ہوں اے عشق
کرتے تو ہیں وہ یاد بُرا ہوں کہ بھلا ہوں

ناکام ازل وہ ہوں کہ مٹتا نہیں کوئی
ٹوٹے ہوئے دل کی میں اک افسردہ صدا ہوں

اُو نیند کے متوالو تمہیں کچھ بھی خبر ہے
منزل ہے ابھی دور اُٹھو بانگِ درا ہوں

عاصی ہوں خطا دار ہوں عصیاں ہے مرا شیوہ
جو کچھ ہوں مگر بندۂ اربابِ صفا ہوں

مدت ہوئی ہے جلوہ گزیں وہ میرے دل میں / کیا کہیے خود آئینہ ہوں آئینہ نما ہوں

ٹلتا تو ہے مٹ جاؤنگا جب چاہو مٹا دو / مٹ کر بھی رہِ عشق میں نقشِ کفِ پا ہوں

ہو جائے گا مقبول اِس اُمید پہ اے شوقؔ
سجدے کو میں سنگِ درِ جاناں پہ جھکا ہوں

۱۹۴۲ء

شوق ہے جبکہ راہ نما حاجت رہبری نہیں / یہ بھی ہے حسنِ اتفاق ساتھ میں گمرہی نہیں

لاکھ بہائے اشکِ تر سوز میں کچھ کمی نہیں / عشق نے کیا لگائی آگ جو کہ ابھی بجھی نہیں

اپنی خبر نہو جسے واقفِ راز ہے وہی / جس میں پلٹ کے ہوش آئے وہ کوئی بیخودی نہیں

ہوش رہا نہ تابِ دید برق چمک کے رہ گئی / طور ہوا تھا جس سے خاک وہ کہیں روشنی نہیں

پڑھتا ہوں میں نمازِ عشق شیوہ عجز ہے نیاز / جو نہ کبھی قبول ہو ایسی یہ بندگی نہیں

درد کی وہ چمک رہی ٹیس رہی تپک رہی / جس میں ہو کچھ سکوں نصیب وہ کوئی زندگی نہیں

محفلِ کیف و رنگ کی دل کو ابھی ہے جستجو / کھول دے رازِ عشق جو وہ میری خامشی نہیں

ہے یہ نظامِ بیخودی محفلِ سوز و ساز میں / جتنے ہیں دم بخود ہیں سب نام کو برہمی نہیں

دردِ نہاں نہ سوزِ عشق جوشِ جنوں نہ بیخودی / تو نے دیا تو کیا دیا دولتِ دائمی نہیں

گونجتی ہے صدائے حق کان ہیں آشنا ضرور / دل میں ہے عشقِ سرمدی ہمتِ سرمدی نہیں

چاہا تھا ہم نے بارہا حرمتِ توبہ کیجیے / دیکھ کے دورِ میکشی ہمت دل بندھی نہیں

خوفِ گنہ کا ذکر کیا شوقؔ تمھیں خبر بھی ہے
دامنِ تر ہے نام کو اس میں ذرا نمی نہیں

۱۹۴۲ء

وہ جلوے حُسن کے ہم کو دکھائے جاتے ہیں
ہر ایک بار ہم اپنا جھکائے جاتے ہیں

ستم زدوں پہ ستم اور ڈھائے جاتے ہیں
جو مر مٹے ہیں وہی پھر مٹائے جاتے ہیں

ازل سے حسن تو ہے بے نیازِ عشقِ مجاز
اسی کے جلوے اک عالم پہ چھائے جاتے ہیں

نہ پوچھے کوئی یہ ہم سے ملیگا کیا اس میں
کہ نقشِ ہستی کو ہم خود مٹائے جاتے ہیں

جسے ہو دیکھنا آئے وہ دیکھ لے منظر
حیات و موت کے جھگڑے چکائے جاتے ہیں

قبول ہو کہ نہ ہو سجدۂ جبینِ نیاز
وہ محویت ہے کہ ہم سر جھکائے جاتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ رہبر نے ہار دی ہمّت
الٰہی خیر، قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

اٹھا نا دید کے متوالے دیکھ بھال کے آنکھ
حریم ناز کے پردے اٹھائے جاتے ہیں

انھیں تو چھاتی سے ہم نے لگائے رکھا ہے
ہمارے داغ کہیں کیوں مٹائے جاتے ہیں

چلو بھی چھوڑ کے اے شوقؔ جلوہ گاہِ مجاز
نظر میں کس کے یہ جلوے سمائے جاتے ہیں

۱۹۴۲ء

خو گرِ ضبط ہوں اور ضبط میں تاثیر نہیں
دکھ بھری آہ نہیں نالۂ شبگیر نہیں

کاتبِ ازل تجھ سے یہ کیا سہو ہوا
کوئی تحریر یں پردۂ تقدیر نہیں

بےخودی میں وہ ہوا جو بھی ہوا جانے دو
ناشکیبائیِ دل قابلِ تعزیر نہیں

آپ دیکھیں تو سہی کیسی خلش کیسا غبار
شیشۂ دل ہے مرا آئینۂ تصویر نہیں

ہو کا میداں نظر آتا ہے بیابانِ جنوں
یہ وہ صحرا ہے کہ جس میں کوئی نخچیر نہیں

آپ ہی کہتی ہے جل جل کے وہ اپنی بپتا
شمع کو حاجتِ پروانۂ دلگیر نہیں

ہر دو عالم ہیں تماشاگہِ دیوانۂ عشق
ایسے سودائی کو پابندیِ زنجیر نہیں

ہے یہ نیرنگیِ نقاشِ ازل - کیا کہیے
ایک ہی رنگ میں ہر پیکرِ تصویر نہیں

کیف آزادگیِ مشربِ رنداں مت پوچھ
مدتوں سے درِ میخانے میں زنجیر نہیں

ہر طرف بزمِ تصور میں ہے جلووں کی بہار
ڈھونڈتی ہیں جنھیں آنکھیں وہی تصویر نہیں

کر دیا قیدِ تعین سے جنوں نے آزاد
اب وہ زنداں نہیں وہ ہم نہیں زنجیر نہیں

ایک ہی دائرہ ہے منظرِ عالم کا ظہور
لامکاں وہ ہے کہ جس میں کوئی تعمیر نہیں

تن بہ تقدیر رہو - شوق یہ رونا کیسا
بخت برگشتہ کے آگے کوئی تدبیر نہیں

سنہ ۱۹۴۲ء

میں ترا زینتِ کاشانہ ہوا جاتا ہوں
بزم میں شمع کا پروانہ ہوا جاتا ہوں

رونقِ محفلِ رندانہ ہوا جاتا ہوں
دور میں گردشِ پیمانہ ہوا جاتا ہوں

پھر مجھے بیخودیِ عشق لیے جاتی ہے
رحم کر رحم کہ دیوانہ ہوا جاتا ہوں

مجکو ساقی سے غرض اور نہ میخانے سے
مے سرجوش کا مستانہ ہوا جاتا ہوں

کثرتِ جلوہ سماتی ہی نہیں نظروں میں
خود ہی بتخانہ صنم خانہ ہوا جاتا ہوں

کوئی سنتا نہیں بے کیف کہانی میری
کچھ جو کہتا ہوں تو افسانہ ہوا جاتا ہوں

کوئی ارماں نہ تمنا نہ خلش اور نہ درد
پھر میں اپنے ہی سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں

کیا قیامت ہے کہ ہم راز چھٹا جاتا ہے
جادۂ عشق میں بیگانہ ہوا جاتا ہوں

ہر رگ و پے میں نظر آتا ہے حسنِ دلکش
خود بخود جلوۂ جانانہ ہوا جاتا ہوں

کون پھر قلقلِ مینا سے کرے گا باتیں
جوشِ مئے دیکھ کے مستانہ ہوا جاتا ہوں

یہ بھی اعجاز ہے اے بیخودیِ عشق ترا
ہوش میں ہوش سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں

دور میں آتے ہی رندوں کے نچا لے کیوں شوق
اک چھلکتا ہوا پیمانہ ہوا جاتا ہوں

۱۹۴۲ء

یوں بھی ہم طبیعت کو بہلا رہے ہیں
فسانہ محبت کا دہرا رہے ہیں

زمانہ انھیں یاد کرتا ہے کیونکر
ہم ان کو وہی ذکر سنوا رہے ہیں

سمجھنے کی جو بات تھی وہ نہ سمجھے
اب اپنے کئے پر وہ پچھتا رہے ہیں

یہ کہنا کسی کا کہ تم اور محبت
مجھے بیٹھے بیٹھے وہ رلوا رہے ہیں

یقیں ہے کہ کھل جائے سرِ حقیقت
تصور کے پردے کو اٹھوا رہے ہیں

محبت میں کام آ گئی اشک باری
لگی دل کی آنکھوں سے بجھوا رہے ہیں

یہ کس بے مروت سے پالا پڑا ہے
سمجھتا نہیں لاکھ سمجھا رہے ہیں

جفا پر جفائیں ستم پر ستم ہے قیامت ہی کیا کیا ستم ڈھا رہی ہیں
جنوں ہے کہ وحشت ہے اے شوق یہ کیا
کہ پھر جیب و داماں سیئے جا رہے ہیں

۱۹۴۳ء

دل والے پہلے دیدۂ دل پر نظر کریں پھر امتیاز جلوۂ شام و سحر کریں
آئے مقامِ ہو۔ تو جنوں کو خبر کریں وحشت سے پوچھیں عزمِ سفر اب کدھر کریں
ہے مقتضائے عشق کہ اب تجھے نہو گلا۔ چپ سادھ کر بتائیے کب تک بسر کریں
ناوک پہ ناوک آئے مگر سب نے کی خطا پیکاں وہ آئیں شوق سے دل میں جو گھر کریں
آہ و فغاں ہے ننگ نہ ممکن ہے ضبط و صبر آخر شبِ فراق میں کیونکر بسر کریں
کام آئیں گی نہ بزم میں نظّارہ بازیاں جلوؤں کا ہے ہجوم سنبھل کر نظر کریں
لایا سوادِ شام کہاں سے کہاں ہمیں غربت میں سوچتے ہیں کہ کسکو خبر کریں
دل دادگانِ عشق سے دل چاہتا ہے یہ فریاد بھی کریں تو بہ طرزِ دگر کریں
دنیا میں رہ کے چاہیے عقبیٰ کا ہو خیال لے دے کے کچھ مہیّا زادِ سفر کریں
کس نے ہیں شاعرانِ جہاں کے ہیں رمز جو اب اُس کی دیکھ بھال بھی اہلِ ہنر کریں
دونوں ہی اب تو دشمنِ جاں ہو گئے ہیں شوقؔ
دل کو سنبھال لیں تو علاجِ جگر کریں

۱۹۴۳ء

چار دن کی زندگی عمرِ رواں سمجھا تھا میں
راحتِ دنیا کو عیشِ جاوداں سمجھا تھا میں

سچ جو پوچھو یہ درِ تبخانہ کی عظمت ہی تھی
ایک مدت تک اُسی کو آستاں سمجھا تھا میں

چار تنکے رہ گئے تھے خشک سی ایک شاخ پر
وائے ناکامی انھیں کو آشیاں سمجھا تھا میں

بیخودی میں کہدی دل کی ساری سرگذشت
مختصر سی تھی کہانی۔ داستاں سمجھا تھا میں

رہبری کی دل نے آخر بارگاہِ عشق تک
یہ وہی منزل تھی جسکو بے نشاں سمجھا تھا میں

کیسے نازک غنچے تھے جو کھلتے ہی مرجھا گئے
باغِ ہستی کو بہارِ خزاں سمجھا تھا میں

لے گیا دیر و حرم سے سوئے تبخانہ مجھے
بیخودی میں دل کو میرِ کارواں سمجھا تھا میں

وہ بھی اِک رُوداد تھی جو تمسے کہنی رہ گئی
سچ جو پوچھو اسکو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

سیر کیا کی عالمِ ہو کی کہ آنکھیں کھل گئیں
اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں۔

دیکھ تو جل بھن کے خاکستر ہوا جاتا ہے کون
تجھ کو تو اے شمعِ محفل گل فشاں سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی دل کو محرومِ جفا سمجھیں گے آپ
دم بخود رہنے کو بھی طرزِ فغاں سمجھا تھا میں

انتہائے ضبط سے اے شوقؔ یہ دھوکا ہوا
دیکھکر خاموش۔ دل کو بے زباں سمجھا تھا میں

۱۹۴۳ء

کس کے لئے بتائیے کیا آرزو کریں
جب دل ہی مٹ چکا ہو تو کیا چارہ جو کریں

قاتل سے چھین لے کوئی یہ تیغِ نیم کش
بسمل جو بے زبان ہو تو کیا گفتگو کریں

ڈھونڈھا کئے مکاں سے تجھے تا بہ لامکاں
تو ہی بتا کہ تیری کہاں جستجو کریں

تر دامنی پہ اپنی ہمیں ناز کیوں نہو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سوتے او ر ہے شیکوۂ جور و جفا یہاں — کیوں کر بیاں صدمۂ غم دو بدو کریں
کیا جانے اس کو سمجھئے کیا کشتگانِ عشق — دامانِ تیغِ ناز - نہ وقفِ لہو کریں
بحرِ تعینات سے اب دور تر ہیں ہم — تر دامنی کا نام نہیں کیا وضو کریں
دل کو گئے ہوئے تو زمانہ گذر گیا — اسی کی تلاش جا کے کہاں چار سو کریں

پیرِ مغاں سے شوق صبوحی کہاں نصیب
دل چاہتا ہے بیعتِ دستِ سبو کریں

۱۹۴۳ء

حالِ زارِ دل تصور میں سنا سکتا ہوں میں — چپکے چپکے اپنی بپتا سب سنا سکتا ہوں میں
بیخودیِ دل سہارا دے تو کچھ مشکل نہیں — ایک دم میں ساری دنیا کو بھلا سکتا ہوں میں
ختم اے ناصح نصیحت ہو چکی بس ہو چکی — بتکدہ میں اک نیا کعبہ بنا سکتا ہوں میں
ذرہ ہائے دل کو تو چشمِ حقارت سے نہ دیکھ — خاک ہونے پر بھی ایک دنیا بسا سکتا ہوں میں
جاں نثاری عشق میں اک کھیل ہی دنیا کا — بات کہتے نقشِ ہستی کو مٹا سکتا ہوں میں
ڈھونڈنے پر بھی کسی کا آستاں ملتا نہیں — ورنہ سجدے کو جبیں اپنی جھکا سکتا ہوں میں
کشتۂ حرماں سے جو کچھ دل پہ گذری ہی نہ پوچھ — اسکو دہرا کر زمانے کو رلا سکتا ہوں میں
زدِ محفل میں پیمانی کی صلائے عام ہے — ظرف عالی ہو تو جامِ مے پلا سکتا ہوں میں
خوش خرامی پر عبث ہے ناز اے سرمستِ ناز — اک ٹھوکر سے اٹھتے فتنوں کو سلا سکتا ہوں میں

وہ کشش رکھتی ہے میری نغمہ سنجی ہم صفیر — ایک لے سے جذبۂ خفتہ جگا سکتا ہوں میں
اے تغافل کیش کیسا ہے یہ تیرا اجتناب — جذبِ دل سے اپنا سا تجکو بنا سکتا ہوں میں
اک نگاہِ واپسیں کہدے گی سارا رازِ دل — حالِ ماضی آنکھوں آنکھوں میں بتا سکتا ہوں میں

خاموشی میں ہے نہاں اے شوقؔ رازِ بیخودی
ورنہ صرفِ دردِ غم اپنا سنا سکتا ہوں میں

۱۹۴۳ء

دیوانہ پن بھلا کہ کوئی بدگماں نہیں — دنیا ہے اسکی اس کا ٹھکانا کہاں نہیں
پُر لطف خامشی ہے کہ گویا زباں نہیں — اب تک جو دل سے آئی وہ میری فغاں نہیں
ماہی سے تا بماہ تجلّی ہے نور کی - — تو کس جگہ نہیں ترا جلوہ کہاں نہیں
ڈھونڈے سے ذرّہ خاک کے ملتے نہیں کہیں — جو خود مٹا ہوا اُس کا کوئی امتحاں نہیں
اس نیند کا بُرا ہو کہ سوتے ہی رہ گئے — آنکھیں کھلیں تو کوئی پسِ کارواں نہیں
میرے اسیر ہوتے ہی بگڑا چمن کا رنگ — وہ گل نہیں وہ باغ نہیں باغباں نہیں
پہونچا دیا ہے جوشِ جنوں نے عجب جگہ — میدان ہو ہے جسمیں کوئی پاسباں نہیں
دیر و حرم میں سر کو جھکایا ہے تو نے تو — سجدہ کہاں کریں کہ کوئی آستاں نہیں
ہر اک اسیر رکھتا ہے طرزِ فغاں جدا — صیاد جسکو سمجھے وہ اپنی زباں نہیں
تو ہی بہارِ گل تیرا ہی تو چمن چمن — تو کس جگہ نہیں ترا جلوہ کہاں نہیں
سازِ شکستہ میں بھی ہیں نغمہ سرائیاں — آہنگ دل ہے کہتے ہو اس کا نشاں نہیں

کہتا ہوں میں تصورِ بے بال و پر سے شوقؔ
لے چل مجھے وہاں کہ جہاں آسماں نہیں
۱۹۴۵ء

سوزِ نہاں ہے درد ہے اس میں کمی کہاں
اِک آگ شعلہ زا ابھی تک بجھی کہاں

وہ بیخودی و شور کہاں خود سری کہاں
ساقی نے خود پلائی ہے سرمستگی کہاں

دیر و حرم میں ختم جبیں سائیاں ہوئیں
سر پھوڑیں جا کے شوق میں اب گمرہی کہاں

دیوانہیں اور بکار خود ہشیار ہیں مگر
افشائے راز جس سے ہو دیوانگی کہاں

لذت شناس ذوقِ طلب ہو گیا ہے دل
اب جائے بھی تو جائے غمِ دنیوی کہاں

سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں رہی
پہنچا دیا ہے تو نے مجھے بیخودی کہاں

گذری ہے عمر عالمِ خاکی میں ہمدمو
گر سیرِ لامکاں ہو تو پھر آدمی کہاں

جلتا تھا آشیاں کہ قفس سے دھواں اٹھا
یہ آگ بجھ گئی بھی کدھر اور لگی کہاں

اٹھے قدم نہ جادۂ منزل کو دیکھ کر
رستے میں چھوڑ کر گئی واماندگی کہاں

داغِ جبیں مٹائے سے مٹتے نہیں ہیں اب
سجدہ سے بے نیاز ہو وہ بندگی کہاں

نیرنگیاں زمانے کی پیشِ نظر ہیں شوقؔ
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ آسودگی کہاں
۱۹۴۴ء

سحر اُٹھ اُٹھ کے کیا کیا شکوہ بیداد کرتا ہوں
فرشتے شوق سے سنتے ہیں جو فریاد کرتا ہوں

کہاں کا انتظارِ حشر فردائے قیامت کیسا
ترا شکوہ تجھی سے اے ستم ایجاد کرتا ہوں

بھرم رکھنا کہیں رسوا نہ ہو بزمِ حریفاں میں
بھروسہ میں تجھی پر اے دلِ ناشاد کرتا ہوں

دلِ غم کش کی ویرانی تو اب بھی نہیں جاتی
خیالی صورتوں سے پھر اسے آباد کرتا ہوں

اسیرانِ چمن کی یاد رہ رہ کر رلاتی ہے
تو گھبرا کر طوافِ خانۂ صیاد کرتا ہوں

نگاہِ یاس کہہ دیتی ہے روداد غمِ پنہاں
زباں سے کچھ نہیں کہتا مگر فریاد کرتا ہوں

حدِ ادراک تک پہنچا دیا شوقِ پرستش نے
بتوں کو پوجتا ہوں اور خدا کو یاد کرتا ہوں

وہ عالم بیخودی کا وہ ہجومِ جلوۂ خاموش
میں اپنی دھن میں سیرِ عالمِ ایجاد کرتا ہوں

یہ نیرنگیٔ عالم کا تماشا ہے نظر ڈالو
چمن میں خاک اڑتی ہے تو گھر آباد کرتا ہوں

تبسم لب پہ اور چتون وہ تیکھی کرکے کہتے ہیں
سنبھل او مرنے والے اک نئی بیداد کرتا ہوں

دلِ راحت طلب تھا ہمنشیں تھے بزمِ رنگیں تھی
میں اپنی عمرِ رفتہ کیا کہوں کیوں یاد کرتا ہوں

میرے سجدے بھی مشروطِ طاعت نہیں ہیں بے اثر اے شوق
دو عالم بھول جاتا ہوں اسے جب یاد کرتا ہوں

۱۹۴۴ء

گلستانِ محبت میں بہارِ بے خزاں میں ہوں
شمیمِ روح پرور ہر رگِ گل میں نہاں میں ہوں

ستم پروردہ میں ہوں خوگرِ آہ و فغاں میں ہوں
بلاکش سا بلاکش ہو کے زیرِ آسماں میں ہوں

جسے چھیڑے ہوئی مدت وہ ننگ ہمرہاں میں ہوں
کبھی بانگِ درا تھا اب غبارِ آسماں میں ہوں

کبھی تو سننے والے اک کہانی شوق سے سن لے
کبھی دل سے نہ بھولے وہ مرا یاد استاں میں ہوں

کلی چٹکی کھلے غنچے چمن پھولا میرے دم سے
نسیم جانفزا میں ہوں بہار بوستاں میں ہوں

اسی دل نے بھرم کھویا اسی دل نے کیا رسوا
نہیں جس کا کوئی گاہک وہ جنسِ رائیگاں میں ہوں

زمینِ غمگساری ہوں انیسِ کنجِ تنہائی!
نہ پوچھو کون ہوں کیا ہوں نشانِ رفتگاں میں ہوں

نہیں باقی رہا کچھ امتیازِ وحدت دکثرت
جنونِ شوق کی وہ انتہا ہو اب جہاں میں ہوں

فنا کی جستجو میں یہ پیامِ مرگ کا کہنا:
سکونِ دائمی میں ہوں نشاطِ جاوداں میں ہوں

مرا جذب تصور تا فلک جا کر یہ کہتا ہے
تلاشِ لامکاں کیوں ہو محیطِ لامکاں میں ہوں

میری دیوانگی کا راز کچھ کھلنے نہیں پاتا!

غضب کی گمرہی ہے راہنمائے گمرہاں میں ہوں

یہ پروازِ تصور اور اس کی جستجو اے شوق
دو عالم چھان ڈالے اب کہاں تک پرفشاں میں ہوں

۱۹۴۴ء

نہاں ہے رازِ عجب پردۂ حقیقت میں
تمام عمر گذاری ہے شوقِ حیرت میں

یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صورت میں
کہ دل ہے گوش بر آواز آنکھیں حیرت میں

یہ بیخودی یہ تصور ہے جوشِ الفت میں
کہ خود کو دیکھ رہا ہوں کسی کی صورت میں

بقا کے بعد فنا ہے، فنا کے بعد بقا
حیات و موت ہیں مضمر بشر کی صورت میں

کہاں وہ جلوہ گہِ ناز عقل و فہم کہاں
کہ آئینہ کو بھی حیرت ہے بزمِ خلوت میں

تصورات کا عالم تعینات کی قید
عجیب راز نہاں ہے عیاں حقیقت میں

یہ قبض و بسط یہ جذب و سلوک ناممکن
گذر محال ہے کثرت کا بزمِ وحدت میں

نہ مقتضائے وفا ہے جفا و جور کا ذکر
کہ تلخ کامیاں ہیں شکوہ شکایت میں

نہ جانے بیخودیٔ عشق ہے کہاں لائی
نشان اپنا بھی ملتا نہیں ہے غربت میں

الٰہی اور ہو جوشِ جنوں کی عمر دراز
بڑے مزے سے گذرتی ہے دشتِ وحشت میں

خبر لے دستِ جنوں راہ طے نہیں ہوتی
نہ ڈگنے پائیں قدم منزلِ طریقت میں

یہ انقلاب یہ دورِ فلک یہ گردشِ دہر
پڑا ہے ہر کس و ناکس عجب مصیبت میں

کہاں وہ مجمع احباب وہ کہاں جلسے
وہ ذوق و شوق وہ سرگرمیاں محبت میں

جفا و جور کے صدمے وہ شوق کیا جانے
کہ جس نے عمر بسر کی ہو عیش و راحت میں

سنہ ۱۹۴۵ء

چشمِ حیراں تجھے کیوں اور بھی حیراں نہ کروں
جستجو عشق کی کیا تا حدِ امکاں نہ کروں

جو نہ چمکیں مری پلکوں پہ ستارے بنکر
ایسے اشکوں کو کبھی زینتِ داماں نہ کروں

دل ہی جب تک ہے سر و ساماں بھی ہے امید لگا
دل ہی مٹ جائے تو پھر میں کبھی ساماں نہ کروں

یاد جب آئے وطن میں تو یہ ممکن ہی نہیں
تذکرہ تیرا میں اے شامِ غریباں نہ کروں

حسن در پردہ ہے بیتاب تماشائے عشق
شوقِ نظارہ کا جلوہ ابھی عریاں نہ کروں

اشک رنگیں تو کئے دیتے ہیں رسوا مجکو
جی میں آتا ہے انھیں زینتِ داماں نہ کروں

سوزِ دل ولولۂ عشق یہ آغازِ جنوں
کس کو ظاہر میں کروں کسکو نمایاں نہ کروں

شرمگیں آنکھ ملانے سے تو ملتی ہی نہیں
خود ہی نادم ہیں انھیں اور پشیماں نہ کروں

اپنی ناکامیِ قسمت پہ نہ روؤں کیونکر
آس مٹنے پہ بھی کیا شکوۂ حرماں نہ کروں

درد سے ربط ہے ایسا کہ خدا خیر کرے
دل کو رہنے بھی دوں شرمندۂ درماں نہ کروں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ نظامِ امکاں
دل کے شیرازۂ ہستی کو پریشاں نہ کروں

خود فراموشی میں گذرا ہے یہ دورِ غفلت
دل یہ کہتا ہے کہ اندازۂ عصیاں نہ کروں

ایک جھونکا ہی بجھا دے نہ کہیں شمعِ حیات
کس لئے فکرِ چراغِ تہِ داماں نہ کروں

آہ یہ رنگِ چمن آہ یہ نیرنگِ بہار
اے جنوں ایسے میں کیوں چاک گریباں نہ کروں

کچھ بتا دو تمہیں اے شوقؔ علاجِ غمِ عشق
چاہتا ہوں گلۂ گردشِ دوراں نہ کروں
۱۹۴۵ء

محبّت کو جو ٹھکرائے اسے کاہل سمجھتا ہوں
جنوں میں ہوش کی باتیں کمالِ دل سمجھتا ہوں
یہ ہی اپنے لئے میں عشق کا حاصل سمجھتا ہوں
کوئی شے جب تڑپتی دیکھتا ہوں دل سمجھتا ہوں
قدم بڑھتے ہی آگے ہوگئیں ناکامیاں رخصت
میں اپنے ہر قدم کو حاصلِ منزل سمجھتا ہوں
دلِ شوریدہ ہو جاتا ہے اکثر منحرف مجھ سے
مگر پھر بھی میں ایسے دل کو اپنا دل سمجھتا ہوں
یہ مانا زینتِ محفل کے ساماں اور ہیں لیکن
دلِ حسرت فزا کو رونقِ محفل سمجھتا ہوں
جو آہیں کھینچ کر ٹھنڈا ہوا وہ کشتۂ غم ہے
تڑپ کر جو نہ ٹھنڈا ہوا اُسے بسمل سمجھتا ہوں
یقیں ہے اے جنوں پردہ نشیں اب ہو نہیں لیلےٰ
کہ پہلو میں میں اپنے دل کو بھی محمل سمجھتا ہوں

محیطِ عشق میں کیا کیا تلاطم خیز موجیں ہیں
مگر پھر بھی اُنھیں میں تشنۂ ساحل سمجھتا ہوں

مٹے سے کچھ نشانِ رفتگاں باقی ہیں جو اب تک
اُنھیں نقشِ قدم کو جادۂ منزل سمجھتا ہوں

کہاں جائے یہ شوقِ بے نوا آخر کہاں جائے
ترے در پر رہے میں اِس کو اِس قابل سمجھتا ہوں

سنہ ۱۹۴۲ء

بگڑی شکلیں کیا بنانی آ گئیں — خاک میں پیہم مٹانی آ گئیں
خونِ دل بہنے لگا اشکوں کے ساتھ — آنکھیں رو رو کر سجانی آ گئیں
دردِ دل سوزِ نہاں فرقت کی رات — آنکھیں تاروں کو دکھانی آ گئیں
حسرتیں ہیں داغ ہیں اور آہ بھی — بستیاں دل میں بسانی آ گئیں
آپ کی بے مہریاں لے مہرباں — دل کو رہ رہ کر ستانی آ گئیں
رفتہ رفتہ وہ حجاب اٹھ ہی گیا — باتیں بھی جھوٹی بنانی آ گئیں
مان جائے دل تو ہو سیرِ چمن — کیا کہیں راتیں سہانی آ گئیں
اشک اُمنڈے تھے مگر ہم پی گئے — سوزشیں دل کی بجھانی آ گئیں
شکوۂ گلچیں سے یہ حاصل ہوا — شاخ ہائے گل جھکانی آ گئیں
داغِ دل آہوں نے روشن کر دیئے — شمعیں محفل میں جلانی آ گئیں

دیکھ کر یہ کارفرمائے عشق
راز کی باتیں چھپانی آگئیں

دیکھ کر مینا سے مے کا انکسار
گردنیں رندو جھکانی آگئیں

یہ جبیں سائی تھی آخر کام کی
کچھ لکیریں تھیں مٹانی آگئیں

جو پڑی افتاد جھیلی عشق میں
سختیاں دل کو اٹھانی آگئیں

دیکھ کر رفتار کو اس شوخ کی
یاد سب چالیں پرانی آگئیں

عشق ہے بدنام رسوا حسن ہے
کیا بلائیں ناگہانی آگئیں

شوق نے مصرعہ دیا البیلا کہ شوق
رنگ رلیاں پھر منانی آگئیں

سنہ ۱۹۴۰ء

دل جیسے دیوانے کو
وقت کہاں سمجھانے کو

زاہد تو کیا یاد کرے گا
دیکھ تو اے میخانے کو

سوز فرقت بزم ہے سونی
آنے دے پروانے کو

سامنے ہے وہ موہنی مورت
چل تو سہی بتخانے کو

ہم جو بگڑے مشکل ہو گی
سمجھا کیا ترسانے کو

تو ساقی ہیں مست الستی
بھر دے ہاں پیمانے کو

دل ہے وحشی دیوانہ
جانے دو ویرانے کو

بے تکی باتیں بکنے لگے گا
چھیڑ نہ اب دیوانے کو

قلب و جگر میں آگ لگی ہی　ساقی چل میخانے کو
ہوش میں بھی مدہوشی ہی　ہوش نہیں دیوانے کو
پروانہ جل کر خاک ہوا　آیا کیوں جل جانے کو
ساری باتیں اُس میں ملیں گی
سُن لو شوقؔ کے افسانے کو

سنہ ۱۹۴۴ء

بادہ کش وہ ہی کہ مستی میں بھی جس کو ہوش ہو
جوش میں ساغر بکف، ہو میکدہ بردوش ہو
ذوقِ مے نوشی نہ کیفِ بادۂ سرجوش ہو
ایسا میں سرشار ہو جاؤں نہ برسوں ہوش ہو
کس لئے خاموش ہو کس کے لئے روپوش ہو
جانے والو ہم نہ پوچھینگے کہ کیوں خاموش ہو
مانتا ہی وہ نہیں گو لاکھ سمجھایا اُسے
ایسے دل کو کیا کریں جو خود اذیّت کوش ہو
حسرت وارماں مچل کر کیوں نہ دل میں چھپ رہیں
دیکھتے ہی دیکھتے جب ہمنوا خاموش ہو
ننگِ ہمت ہے اگر ضبطِ فغاں ممکن نہیں

آہ لب پر ہو۔ زباں پر نغمۂ خاموش ہو
کچھ بہک کر پھر سنبھلنا۔ شرطِ بیہوشی نہیں
مست وہ۔ بیہوش ہو کر میکدہ بردوش ہو
اب نہ وہ سودا رہا باقی نہ وہ جوش جنوں
ایسے سر سے باز آئے جو وبالِ دوش ہو
ضبط نالہ ہو نہ آہِ جاں گزا ہو ہجر میں
سازِ دل۔ سوزِ جنوں۔ اِک بربطِ خاموش ہو
کیسا ساغر کیسا پیمانہ لنڈھادے خم کے خم
دور میں رندوں کے لب پر شورِ نوشانوش ہو
جلوہ گاہِ حسن تھا پہلو میں اب وہ دل نہیں
کس کو دے بیٹھے بتا اے بیخودی کچھ ہوش ہو
احترامِ میکدہ ہر دم رہے مدِّ نظر
شوقؔ آؤ ہوش میں کیوں میکدہ بردوش ہو

سنہ ۱۹۲۴ء

قصۂ دردِ رفتگاں نہ سنو　　مر مٹو نکی ہے داستاں نہ سنو
کیا کہے بیزباں ہے کشتۂ عشق　　مان جاؤ وہ داستاں نہ سنو
یہ تو میرا ہی قصۂ غم ہے　　کیسے کہہ دوں کہ مہرباں سنو

کیوں سجائیں یہ آنکھیں رو رو کر — اور آ گئے وہ داستاں نہ سنو
دکھ کی روداد اور میرے منہ سے — نہ سنو اے عدوئے جاں نہ سنو
اک مصیبت گذر گئی دل پر — ہو گئی وہ بھی رائیگاں نہ سنو
دل پہ کیا جانے کیا ہو اُن کا اثر — آہ و زاری خستگاں نہ سنو
مانگ بیٹھیں نہ جانے کیا تم سے — التجا کے بلاکشاں نہ سنو

ابھی سوئے ستم رسیدہ ہیں
کچھ نہ بول اٹھیں خفتگاں نہ سنو
۱۹۴۵ء

گنہگار کا رحمت پہ آسرا کیوں ہو
گذر ہی جائیگی زحمت خدا خدا کیوں ہو
یہ آستاں ہی تمہارا، جبیں ہماری ہے
دُعا جو آ کے لبوں پر وہ نارسا کیوں ہو
مری نظر سے کبھی شرمگیں نظر نہ ملی
سنبھل کے تیر لگاؤ تو پھر خطا کیوں ہو
اس ہیر پھیر میں قدرت کی مصلحت کیا ہے
فنا کے عہد بقا ہے تو پھر فنا کیوں ہو
وہ کچھ کہیں نہ کہیں ہم الگ ہیں دنیا سے

وفا شعاروں میں رسوا تری جفا کیوں ہو

محیطِ عشق میں کشتی ہی ہم ہیں با موجیں ہیں
زباں پہ نامِ خدا ہو تو ناخدا کیوں ہو

ادا و ناز نے مل جُل کے دل مٹایا ہے
ستمگری میں یہ شہرت جدا جدا کیوں ہو

بہت سُنی ہیں یہ نغمہ سرائیاں اے شوق
ترے ہی سازِ شکستہ کی یہ صدا کیوں ہو

کھینچ کر لایا یہاں کیوں دلِ ناداں مجھکو
سازگار آیا نہ کچھ عالمِ امکاں مجھکو

دامن و جیب کی بڑھ بڑھ کے خبر لینی تھی
تجھ پہ آتی ہے ہنسی چاکِ گریباں مجھکو

کس قدر اُنس ہے وحشت سے کہ اے دستِ جنوں
لپٹا جاتا ہے ہر اک تارِ گریباں مجھکو

وُسعتِ عالمِ ہستی کی حقیقت معلوم
کون ڈھونڈیگا بھلا تا حدِ امکاں مجھکو

حسنِ مغرور تمہیں دیکھے بنا یا خود بیں

اور بے مانگے دیا دیدۂ حیراں مجھکو
نبدگی سے ہے غرض دیر ہو یا سنگ حرم
بندۂ عشق ہوں یہ دونوں ہیں یکساں مجھکو
بھول جانا نہ کہیں قصۂ طور موسیٰ
حسن کہتا ہے نہ دیکھو کبھی عریاں مجھکو
بیخودی کا ہے یہ عالم کہ کچھ احساس نہیں
درد ہو یا ہو سکوں دونوں ہیں یکساں مجھکو
حشر میں داور محشر سے کہوں گا اے شوق
کچھ نہیں یاد ہے اب دفتر عصیاں مجھکو

سنہ ۱۹۴۰ع

دل کہہ رہا ہے کب سے درد جگر نہیں ہے
یہ دیکھکر بھی ظالم اُس پر نظر نہیں ہے
پہلو میں دل نہیں ہے پر نور گھر نہیں ہے
روشن کریں تو کیونکر داغ جگر نہیں ہے
بیرحم باغباں سے اتنا تو کوئی پوچھے
یہ کیا کہ سبز شجر ہیں برگ و ثمر نہیں ہے
فرقت نواز ہم ہیں اتنا کوئی بتادے

ایسی بھی کوئی شب ہے جس کی سحر نہیں ہے
ہے شوق دید لیکن تکمیل ہو تو کیا ہو
لاکھوں تجلیاں ہیں تاب نظر نہیں ہے
یہ کیسی اضطرابی یہ کیسی گرم آہیں
دل میں کھٹک نہیں ہے سوزِ جگر نہیں ہے
کس نے ہمیں بلایا کیوں آئے ہم عدم سے
ہمدم نہ پوچھ ہم سے کچھ بھی خبر نہیں ہے
بھٹکے گا جانے کب تک نا آشنائے منزل
پائے طلب نہیں ہے زادِ سفر نہیں ہے
ہر سو عیاں نہاں ہیں جلوے صنم کدہ میں
پیش نظر ہے سب کچھ تاب نظر نہیں ہے
کیا تھی اُمید تجھ سے اے آہ صبح گاہی
تجھکو بھی آزمایا کچھ کارگر نہیں ہے
بیچین اتنے کیوں ہو ہوتے دو درد دلمیں
ہے کون سی مصیبت جو جاں پر نہیں ہے
کب تک دبائے رکھیں پہلو میں شوق اُسکو
اک تیر بے کماں ہے دل کو سفر نہیں ہے

کہتے ہیں شوق جس کو ہے رازدارِ اُلفت
مُنہ پر کچھ آئے اس کے ایسا بشر نہیں ہے

سنہ ۱۹۴۰ء

محبت بھی شریکِ حالِ فطرت ہوتی جاتی ہے
یہ شرکت میرے حق میں اک مشیت ہوتی جاتی ہے
نگاہِ شوق میں جلوؤں کی کثرت ہوتی جاتی ہے
میری روداد غم ابتو حکایت ہوتی جاتی ہے
کوئی جانے نہ جانے اس میں کیا ہے راز سربستہ
زبان حال سے پھر بھی شکایت ہوتی جاتی ہے
وفورِ گریۂ رنگیں نہیں تھمتا نہیں تھمتا
دل پر خوں کی آنکھوں سے شکایت ہوتی جاتی ہے
وفا ناآشنا ہیں اور جفاؤں پر تلے بیٹھے
سکوں پرور ہماری بھی طبیعت ہوتی جاتی ہے
سنا ہے جائزہ لیں گے وہ آکر جاں نثاروں کا
وہ ہنگامہ ہو برپا اک قیامت ہوتی جاتی ہے
ریاکاری یہ مکاری یہ عیاری فسوں سازی
اور اُس پر پارسائی کی فضیلت ہوتی جاتی ہے

خموشی یعنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

ہمارا دم بخود رہنا شکایت ہوتی جاتی ہے
یہ نیرنگی بہ رنگ آمیزیٔ عالم - معاذ اللہ
کہ دھوکہ کھا گئے بھی دل کو ندامت ہوتی جاتی ہے
جفا کی لذتیں، ذوقِ ستم اے شوق کیا کہئے
دل پر درد کو کچھ اُن سے رغبت ہوتی جاتی ہے

۱۹۴۰ء

شوقِ سجدہ کیوں تلاشِ آستاں میرے لئے
بے نیاز آستاں ہو امتحاں میرے لئے
حسن کی نیرنگیاں عالم میں طشت از بام ہیں
عشق رسوا ہے مگر راز نہاں میرے لئے
جلوہ ہائے قدس کی رعنائیاں تھیں دلفریب
دور تھا کیا کچھ مکاں سے لامکاں میرے لئے
باغباں سچ تو بتا تیری حمیت کیا ہوئی
چار تنکوں کا یہ رکھا آشیاں میرے لئے
آفت ارضی سماوی - دورِ دورِ بے پناہ
دونوں یکساں ہیں زمین و آسماں میرے لئے

میری نغمہ سنجیوں سے پتہ پتہ مست ہے
نخل کیا سارا چمن ہے گُل فشاں میرے لئے

نغمہ سنج سازِ گُلشن ہوں اسیرانِ قفس
آتے آتے آ گئی طرز فغاں میرے لئے

پا شکستہ دور منزل دشت ویراں راہ سخت
رہنما لیکن ہے گردِ آسماں میرے لئے

ربط جس کو کچھ نہ ہوتا سوز و ساز عشق سے
ایسا ملتا کوئی انداز بیاں میرے لئے

ہمصفیرو زمزمہ سنجی مبارک ہو تمہیں
چاہئے ہلکی سی اک طرز فغاں میرے لئے

کیا کروں کیونکر کھلا دوں اپنے دل سے انکو شوق
حاصلِ اُلفت ہے یادِ رفتگاں میرے لئے

نہ لب ہلاتے نہ اظہار آرزو کرتے — مزہ تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کرتے
ہزاروں شکوے تھے دل میں کہ روبرو کرتے — ٹھہر ٹھہر کے بیاں اُن سے دوبدو کرتے
جو اشک آنکھوں سے ٹپکے لئے وہ دامن میں — مگر یہ دل میں تھا کچھ اور آبرو کرتے
گلا جو خشک تھا خنجر کشیدہ اور ہوا — تیرا لحاظ کہاں تک رگِ گلو کرتے
زباں پہ تیرے تغافل کا ذکر کیا معنی — گلہ جو کرنا تھا تجھ سے وہ موبمو کرتے

چلا نہ جام نہ ساغر نہ دورِ مئے ساقی
چلے گئے ترے میکش سبو سبو کرتے

خدا شناسیٔ مستانِ باخدا مت پوچھ
ادا نماز بھی کرتے تو بے وضو کرتے

یہ زہدِ خشک تھا زاہد کہ تھی ریاکاری
زبان تک نہ گھسی تیری تو ہی تو کرتے

ہزاروں پھول تھے کس کس کو چنتے دامن میں
نہ تھا دماغ کہ تمیزِ رنگ و بو کرتے

تصوّرات میں کی سیرِ ماسوا ہمنے
تمام عمر کٹی تیری جستجو کرتے

جو دیتی بیخودیٔ عشق شوق کو فرصت
تیرے خیال سے اک عمر گفتگو کرتے

۱۹۴۲ء

ایک نظر ادھر بھی ہو موسمِ گل بہار ہے
ایک ہی جام بھر کے دے دیر سے انتظار ہے

عشق میں دل ہے آئینہ آئینہ میں غبار ہے
آتشِ سوزِ عشق سے دل بھی تو داغدار ہے

اے دلِ بیقرار تو صبر سے کچھ تو کام لے
آتے ہی آتے آئینگے کس لئے انتشار ہے

نالے ہیں سارے نارسا آہیں ہیں ساری بے اثر
شکوۂ دل ہے ناروا خود ہی وہ شرمسار ہے

تحفۂ دل ہے بے بہا دیکھ تو لیجئے ذرا !

آئے پسند یا نہ آئے آپ کو اختیار ہے
اپنی ہے سرگذشت کچھ آئیے سن تو لیجیے
آج کہوں گا رازِ دل۔ دل کو ذرا قرار ہے
پرسشِ حشر کا خیال مجھ سے گناہگار کو
ہیں وہ گنہ بیحساب جن کا نہ کچھ شمار ہے
مرغِ چمن ہیں نغمہ زن نکہتِ گل ہے کیف زا
ایک کمی ہے آپ کی مستوں کا انتظار ہے
روتے ہی روتے کٹ گئی اشک رواں بھی تھم گئے
شمع زجبر شب ہوں میں صبح کا انتظار ہے
سرخوشِ بادۂ الست آنے لگے ہیں ہوش میں
نشۂ مے اُتر گیا آنکھوں میں کچھ خمار ہے
وصل و وصال ایک ہیں موت ہو یا حیات ہو
باعث لطفِ زندگی گردشِ روزگار ہے
پیرہن حیات میں جائے رفو کہیں نہیں
اس کو تو اب اتار دیئے جامہ مستعار ہے
نیر او آستانِ ناز ۔ اور میرا سر نیاز
پاس گرہ میں کچھ نہیں مایۂ انکسار ہے

لے گئی بیخودی مجھے ایسے مقام پر جہاں
سجدہ مسجد و صنم باعث ننگ و عار ہے
شوق سار ند بادہ کش خم کے خم چڑھا گیا
پھر بھی ہے مے کی جستجو ساقی کا انتظار ہے
شوق اسیر رنگ و بو یوں ہی رہو گے تابہ کے
رنگ چمن بدل گیا۔ خاتمۂ بہار ہے

سنہ ۱۹۴۰ع

وہ چشم و دل سے پردہ ہٹا کر چلے گئے
رنگیں فضا میں خود بھی سما کر چلے گئے
سوتے ہوئے نصیب جگا کر چلے گئے
بیٹھے سروں میں کچھ وہ سنا کر چلے گئے
آغازِ عشق کا یہ فسانہ ہے مختصر!
انجام کار آئے وہ آکر چلے گئے
میں کیا کہوں کہ اُس کے دلاسوں نے کیا کیا
جو بجھ گئی تھی آگ لگا کر چلے گئے
بالیں پہ ان کا آنا تو کچھ یاد ہے مگر
سمجھے نہیں کہ کیا وہ اُٹھا کر چلے گئے

دھندلا سا ایک عکس وہ سمجھا گئے مجھے
اس پر ستم یہ ہے کہ مٹا کر چلے گئے

وہ چشمِ مے فروش کی نظارہ بازیاں
پی خود بھی اور مجھکو پلا کر چلے گئے

بولے نہ منہ سے اور نہ کچھ مجھ سے بات کی
دل مل گیا تو آنکھ چرا کر چلے گئے

دل تھا فریب خوردۂ نقش نگارِ دہر
پھر بھی وہ اپنا نقش جما کر چلے گئے

کیا جانے رہروانِ عدم ہیں کہاں مگر
اِک راہ سخت ہم کو بتا کر چلے گئے

اُف اُف ستم ظریفیٔ سفاک کیا کہیں
ہم کو وہ شوق اور رُلا کر چلے گئے

۱۹۴۵ء

دل میں ازل سے آئے تھے حسرت لئے ہوئے
جاتے ہیں ساتھ ایک قیامت لئے ہوئے

کچھ بڑھ چلیں تو دیکھیں ذرا جلوہ گاہ ناز
ذوق نظر ہے چشم بصیرت لئے ہوئے

کہنے کو ہاں وفا ہے مگر بے وفا نہیں
جاتے ہیں پھر بھی دل کی شکایت لئے ہوئے

جو کچھ ملا ازل میں قناعت اُسی پہ کی
اک دل تھا صد ہزار مصیبت لئے ہوئے

انجامِ باز پرس ہو کیا جانے روزِ حشر
پھرتی ہے وہ نظر بھی قیامت لئے ہوئے

سُنیئے یہ سرگذشت کہ افتادگانِ عشق
سوئے ہوئے ہیں خاک میں عبرت لئے ہوئے

مجبوریاں ہزار تھیں کہتے نہ بن پڑی
ہستی میں آئے ایک حکایت لئے ہوئے

بادِ نسیم نکہتِ گل سے ہوئی ہے مست
اِٹھلا رہی ہے بوئے محبت لئے ہوئے

ناوک پہ ناوک آئیں سپر ہیں دل و جگر
لیکن ادائے شانِ نزاکت لئے ہوئے

اے دل فریب دید سے رہنا تو ہوشیار
جلوے نہاں ہیں وحدت و کثرت لئے ہوئے

بحرِ کرم نو سنتے ہیں ہے جوش پر مگر

کس منہ سے جائیں بارِ ندامت لئے ہوئے

جلوؤں کی کچھ کمی نہیں دنیائے حسن میں
آئینہ خیال ہے حیرت لئے ہوئے

میخانہ روبرو تھا مگر یہ خبر نہ تھی
ہے چشمِ شوق پردۂ غفلت لئے ہوئے

اے شوق چھیڑ وہاں کوئی وحشت کا ماجرا
بیٹھے ہو کیا یہ گوشۂ عزلت لئے ہوئے

سنہ ۱۹۴۰ء

میری خاموشی ازل سے برلبِ اظہار تھی
وارداتِ دل کی شاہد چشمِ حسرت بار تھی

نیم جاں کوئی۔ کوئی بسمل۔ کوئی ہے دم بخود
وہ نگاہِ شوخ ہر دم برسرِ پیکار تھی

ہمصفیرو کس طرح کہتی وہ رودادِ قفس
بلبلِ ناشاد کی ٹوٹی ہوئی منقار تھی

دردِ دل۔ دردِ جگر بیتابیٔ سوزِ نہاں
چارہ گر چپ تھا کچھ ایسی صورتِ بیمار تھی

میٹھی نیند میں سو رہے ہیں کشتگانِ کوئے دوست

کس قدر ٹھنڈی ہوائے تیغ دامن دار تھی

چارہ گر سے آنکھوں آنکھوں میں کہی روداد عشق
ایک ہچکی لب پہ آکر مانع گفتار تھی

بس سہارے سے اسی کے رات ساری کاٹ دی
اب نہ کہنا یہ کہ آہ نیم کش بیکار تھی

یاد اب کس کو ہیں وہ راز و نیاز حسن و عشق
سرگذشت باستانی پردۂ اسرار تھی

شوق جلوہ ذوق نظارہ نہ لایا تاب دید
نام کس کا لیں خطائے دیدۂ خونبار تھی

مشکلیں پیش نظر تھیں سب وہ راہِ عشق کی
کیا قدم اٹھتے جب ایسی منزل دشوار تھی

کس محبت سے سر بالیں وہ خود آئے ہیں شوق
دیکھ لو جی بھر کے تم کو حسرتِ دیدار تھی

سنہ ۱۹۴۰ء

دل کو نہ محوبیت ہے نہ کچھ امتیاز ہے
در پردہ حسن آئینہ ساز باز ہے

دل ہی نیاز مند تھا اب بے نیاز ہے

اے بیخودی یہ کیا کوئی اُلفت کا راز ہے

سجدہ کبھی تو اپنا بھی ہو جائیگا قبول
کب سے اُس آستاں پہ جبینِ نیاز ہے

بگڑی ہوئی بھی دیکھی ہے بنتی ہوئی یہاں
مایوس کیوں ہو وہ تو بڑا کارساز ہے

اے دل کہا تو مان ذرا چل کے دیکھ لے
کیا اُس کی بزمِ ناز کا راز و نیاز ہے

وہ شوقِ دید اور وہ صد جلوہ ریزیاں
دشوار حسن و عشق میں اب امتیاز ہے

واماندگانِ عشق کی ناکامیاں نہ پوچھ
خاموش ہیں مگر یہ خموشی بھی راز ہے

کیا مڑ کے دیکھتے ہو تم اے راہ روانِ شوق
پہلی ابھی یہ منزلِ راہ دراز ہے

جس کی تشفیوں سے تھی ڈھارس بندھی ہوئی
حیرت میں دیکھ آج وہی چارہ ساز ہے

رخ ہے کدھر کو ہاتھ کدھر کو ہیں دل کہیں
اے شیخ خود پسند یہ اچھی نماز ہے

وہ دل کہ جس کو دشمنِ ایماں سمجھتے تھے
اے شوقؔ تم کو آج اُسی دل پہ ناز ہے

۱۹۴۰ء

عشق کا راز ہے کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں امید کہ وہ حشر بداماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخلِ زنداں ہو جائے

درد قابو کا نہیں کاش وہ اُٹھ کر شبِ غم
سرگذشتِ دلِ ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلّی نہ دلاسا نہ کہیں نام کو صبر
حیف اُس دل پہ کہ یوں بے سر و ساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول بڑھے جوشِ نمو
حسنِ پنہاں کسی پہلو سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاک گریباں ہو جائے

جتنے منظر ہیں وہ آجائیں سمٹ کر دل میں
وسعتِ سینہ اگر تا حدِ امکاں ہو جائے

رنگ رنگینیٔ عالم کا تماشا دیکھا
ایک بستی جو بسے۔ شہرِ خموشاں ہو جائے

چشمِ تر۔ نالۂ دل۔ سوزِ دروں۔ دردِ فراق
ایک مہجور کا کیا کیا سر و ساماں ہو جائے

عشق بیباک ہو۔ اور سوزشِ جذبِ کامل
کوئی مشکل نہیں ایسی جو نہ آساں ہو جائے

شوقِ مے نوش کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا
خم میں جو دُرد بچے نذرِ حریفاں ہو جائے

سنہ ۱۹۴۰ء

ہے شوقِ دید دیدۂ غافل لئے ہوئے
آئینہ ہے کہ پردہ حائل لئے ہوئے

افتادنی کہ قافلے والوں سے چھوٹ کر
بیٹھا ہوا ہوں حسرتِ منزل لئے ہوئے

حیرت ہے آئینہ کو یہ کیا ہو گیا ہے آج
اترا رہا ہے جلوۂ باطل لئے ہوئے

کچھ ایسی راس آگئی دیوانگی مجھے
آیا ازل سے طوق و سلاسل لئے ہوئے

اے ہمدمو! تمہارا نہ تھا کیا میں ہمنوا
لو آگیا ہوں گرمیٔ محفل لئے ہوئے

پائے طلب سے طے نہ ہوا جادۂ وفا
دل تھا خیالِ دورئ منزل لئے ہوئے

یہ جزر و مدِّ بحرِ محبت یہ جذبِ شوق
موجیں رواں ہیں دامنِ ساحل لئے ہوئے

اے دیر و کعبہ والو یہ دیکھو مآلِ شوق
میں مطمئن ہوں عشق کا حاصل لئے ہوئے

ظاہر بیں لوگ چاہیں جو سمجھیں مجھے مگر
باطن میں دل ہے آئینۂ دل لئے ہوئے

دریوزہ گر ازل سے دل ناصبور ہے
پھرتا ہے اب بھی کاسۂ سائل لئے ہوئے

کچھ ایسے شوق ہو گئے مانوس اہل بزم
محفل سے میں اٹھا بھی تو محفل لئے ہوئے

۱۹۴۰ء

مستی میں ہے ہشیار وہ دیوانہ نہیں ہے
مجذوب کی ہر لغزش مستانہ نہیں ہے

ظلمت کدۂ دل ہے جلو خانہ نہیں ہے
جلوے ہوں ضیا بار وہ کاشانہ نہیں ہے

دنیائے محبت میں میرا نام ہے اب تک
بھولا ہوا ظالم میرا افسانہ نہیں ہے

دیوانگیٔ عشق ہے اک رازِ محبّت
واقف وہ کیسے کہ جو دیوانہ نہیں ہے

اے شمع بھڑکتی ہوئی لو دشمنِ جاں ہے
جلنے کے لئے سوزشِ پروانہ نہیں ہے

ہو غنچۂ خاطر نہ شگفتہ جسے سنکر
کیوں اس کو نہ کہہ دوں میرا افسانہ نہیں ہے

سجدے کو جھکاؤں میں جبیں دیر و حرم میں
اے شیخ کہاں جلوۂ جانانہ نہیں ہے

سرشار الستی نزامے نوش ازل ہے
پیتا ہے مگر ہاتھ میں پیمانہ نہیں ہے

دل میں کبھی آنکھوں میں کبھی پیش نظر ہے
پردہ میں نہاں جلوۂ جانانہ نہیں ہے

مستِ مئے سرجوش ہے دل روزِ ازل سے

اک جام ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ نہیں ہے
کہتے ہیں جسے عشق وہ ہے تیر حقیقت
دانندۂ مسلک کوئی دیوانہ نہیں ہے
طے منزلِ عرفان جنوں ہو گئی اے شوق
ناکام ازل ہمّت مردانہ نہیں ہے

۱۹۴۱ء

دردِ دل اٹھتا ہے اک سوز نہاں ہوتا ہے
رنگ رخ اڑنے سے ہر راز عیاں ہوتا ہے
خاموشی پر میری کیوں اور گماں ہوتا ہے
تیرا ہی نام ہے جو وردِ زباں ہوتا ہے
لخت دل ہیں کہ بہے جاتے ہیں آنسو بنکر
کچھ خبر ہے تمھیں یہ کس کا زیاں ہوتا ہے
بیٹھے، بیٹھے، سن لیجئے کچھ مہرخ نہیں
ماجرائے دلِ ناساز بیاں ہوتا ہے
خوف رسوائی سے آہیں نہ دبائے سے دبیں
دل میں گھٹ گھٹ کے رہیں اور دھواں ہوتا ہے
الحذر الحذر اے شورش بیتابئی دل

آتشیں نالہ میرا شعلہ فشاں ہوتا ہے
اک نظر سوئے فلک دیکھ کے وارفتہ ترا
پرسشِ حال سے سرگرم فغاں ہوتا ہے
کبھی بھولے سے تصور ہیں جو آجاتے ہیں
دلِ خود رفتہ خدا جانے کہاں ہوتا ہے
خود ٹٹولو تمھیں سینہ میں مسیحا بن کر
یہ نہ پوچھو کہ بتا درد کہاں ہوتا ہے
چشمِ ظاہر کو ہو گیا اُس کی حقیقت معلوم
رازِ کونین اِسی دل میں نہاں ہوتا ہے
حاصلِ عشق ہے کچھ سوز کا باقی رہنا
ایسا انجام محبّت میں کہاں ہوتا ہے
گوش زد کس کی صدا ہوتی ہے پیہم اے شوق
اپنے ہی دل پہ یہ ہر لحظہ گماں ہوتا ہے

۱۹۴۰ء

منزل کڑی تھی عشق کی آساں نہ کر سکے
بے بس تلاش تا حدِ امکاں نہ کر سکے
دشواریاں ہزار تھیں آساں نہ کر سکے

مشکل نہ تھا مگر اُسے آساں نہ کر سکے

پھیکی تھی خونِ دل کی وہ سرخی بھی اسقدر
روداد شوق کا اُسے عنواں نہ کر سکے

کہنے کو ساری رام کہانی کہی مگر
شکوؤں کا تھا ہجوم پشیماں نہ کر سکے

آنکھوں کی کس سے بے سروسامانیاں کہیں
وحشت زدہ تہیۂ طوفاں نہ کر سکے

ساقی وہ بادہ خواروں کو مجبوریاں رہیں
میخانہ کو وہ کعبۂ ایماں نہ کر سکے

اک بزم بیخودی ہے تصور ہے اور ہم
وہ حسن باحجاب تھا عریاں نہ کر سکے

ممکن تھا چارہ ساز کا ملنا ہمیں۔ مگر
ہم خود ہی دردِ عشق کا درماں نہ کر سکے

سمجھا بجھا کے دل کو کیا مائل سکوں!
مضطر مگر تلافی حرماں نہ کر سکے

جوشِ جنوں میں جامہ دری کا رہا خیال
دیوانہ تیرے چاک گریباں نہ کر سکے

متوالے ایسے مست نسیم سحر رہے
گلشن میں بوئے گل کو پریشاں نہ کر سکے
پیہم کشش سحر آہوں کی مجبور ہو کے شوق
داغِ دل و جگر کو فروزاں نہ کر سکے

سلسلہ ۱۹۴۱ء

عدوئے جان و دل سفاک تیری ہر ادا نکلی
اُسے جس رنگ میں دیکھا وہ ہمرنگ قضا نکلی
ہوئی بزم طرب برہم نہ مطرب ہے نہ ساقی ہی
مگر حیرت یہ ہے کس سازِ شکستہ کی صدا نکلی
میری آہیں بھی تھیں اک دفترِ صد سوز و غم اے دل
پتہ اب تک نہیں ملتا زباں سے کیا دعا نکلی
نمایاں ہو گیا آخر اثر جذب محبت کا
اُدھر تیری جفا نکلی اِدھر میری وفا نکلی
ہمیں دیر و حرم یکساں غرض سجدے نہ قشقے سے
وہی جلوہ کہ جس سے دونوں جا شانِ خدا نکلی
دلِ دردآشنا پہلو میں رکھتے تھے کبھی ہم بھی
ہمیں کیا اس سے گر کوئی نئی طرزِ جفا نکلی

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
جب اپنے منہ سے کچھ نکلا تو آہِ بے صدا نکلی

دل صد چاک کی شامت جو آئی جا پھنسا آخر
تیری زلف دوتا خود سر عجب دام بلا نکلی

ہمیں اپنے وفائے دل پہ از بس ناز تھا لیکن
نگاہیں اُس پہ جب ڈالیں تو پامالِ جفا نکلی

دکھانی تھی تجھے اک غنچۂ افسردہ کی حالت
نہ اِس جانب مگر بھولے سے تو موج صبا نکلی

تمہیں سے پوچھتے ہیں شوق ایسی کم رہی کب تک
کہوگے کیا اگر فردِ گنہ روز جزا نکلی

سنہ ۱۹۴۲ء

کھل گیا رازِ محبت بات من مانی ہوئی
سچ جو پوچھو راہ پر آخر پریشانی ہوئی

ایسی بگڑی کچھ نہ سنبھلی کیسی بیگانی ہوئی
جوشِ وحشت میں طبیعت ایسی دیوانی ہوئی

کثرتِ گلہائے رنگیں وسعت گلچین وچمن
باعثِ رسوائیِ دل تنگ دامانی ہوئی

پیچ بتا دے اے ستم کش کیسی گذری دن نوں
آئینہ میں تیری صورت عکس حیرانی ہوئی

عشق اک خاکہ تھا اُس کی ہو گئی تکمیل اب
وحشتِ دل بڑھتے ہی تصویر عریانی ہوئی

حسرتوں کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھا کئے
رہ گئی جو آرزو وہ دشمن جانی ہوئی

بجلیاں دل پر گرا کر حسرتوں کا خوں کیا
یہ نئی عشقِ تبسم ہائے پنہانی ہوئی

نذر ساقی کر دیا جو ایک تھا جامِ سفال
اور نادانی جہاں کی یہ بھی نادانی ہوئی

عشق نے آخر دکھا دی جلوہ گاہِ بیخودی
مشکلیں حل ہو گئیں دشوار آسانی ہوئی

ساقیا میں تیرے میخانے کا دُردِ کش نہیں
وہ پلا خم میں الگ رکھی ہے جو چھانی ہوئی

باغباں تھا تاک ہی میں پڑ گیا گلچیں کا ہاتھ
باعث رسوائیِ گل اس کی عریانی ہوئی

خیر مقدم آؤ پھر کرلیں شب ہجراں کا شوق

پہلے سے ہے یہ بلا کچھ جانی پہچانی ہوئی

۱۹۴۲ء

تیری اے حسن دل کش جلوہ آرائی نہیں جاتی
نہیں جاتی حسینوں کی خود آرائی نہیں جاتی

ہزار آئینہ میں ہے جلوہ گر تنویر کا عالم
کسی صورت سے لیکن شان یکتائی نہیں جاتی

دل درد آشنا کو رکھ کے پچھتا تا ہوں پہلو میں
یہ ہے تصویر درد ایسی کہ کھنچوائی نہیں جاتی

مجھے دہو کے دیئے تو نے دنور شوق میں کیا کیا
فریب دید دیکھا۔ پھر بھی رسوائی نہیں جاتی

سوئے صحرا کبھی کی وحشت دل مجھکو لے جاتی
مگر دشمنت جنوں یہ آبلہ پائی نہیں جاتی

عقیدت آستان ناز سے کچھ ہم کو ایسی ہے
کہ سر سے فطرت ذوق جبیں سائی نہیں جاتی

یہ ساقی بھانپ لیتا ہے کہ کتنا ظرف کس کا ہے
یہ وہ مے ہے کس دنا کس کو پلوائی نہیں جاتی

دل برگشتہ سیدھی بات الٹی ہی سمجھتا ہے۔

سمجھ کی بات دیوانے کو سمجھائی نہیں جاتی

ہماری بزم میں جلوت تھی یارانِ طریقت سے
وہ صحبت اب کہاں باقی یہ تنہائی نہیں جاتی

نہ سُنیئے پڑ گئی اُفتاد کیسی اک بلا کش پر
کہوں کیا۔ وہ کہانی ہے کہ دھرائی نہیں جاتی

کجا ہم اور کجا ایک جرعۂ مے۔ اور کجا ساقی
مگر شیشے کی گردش ہے کہ رسوائی نہیں جاتی

کہو دل سے کہ وہ چشم بصیرت کھول کر دیکھے
یہ تصویر پسِ پردہ ہے دکھلائی نہیں جاتی

نظر آتا ہے ہر ذرہ میں جلوہ حسنِ دل کش کا
کہ مل کر خاک میں بھی اس کی رعنائی نہیں جاتی

رہے ہیں شوق مستِ بادہ سرجوش ہم برسوں
ابھی تک بیخودیٔ کیف صہبائی نہیں جاتی

۱۹۴۳ء

کوئی جو زخمہ زنِ تارِ جاں نثار رہے
شکستہ ساز عجب کیا کہ نغمہ بار رہے

اُمیدِ عفو پہ پیہم خطا شعار رہے

گنہ کو ناز ہے ہم وہ گنہگار رہے
نہ کوئی سرخی ہے جس کی نہ کوئی عنواں ہے
خدا کرے کہ وہ افسانہ یادگار رہے
کبھی ہے آہ۔ کبھی ہے فغاں۔ کبھی نالہ
ہمارے بس یہ ہی دو یار غمگسار رہے
بہ فیض ساقیٔ پیماں شکن رہا ہم پر
کہ پارسا ہی رہے ہم نہ مئے گسار رہے
سکوں ہوا نہ میسّر ہزار ضبط کیا
مزہ اسی میں ہے پیہم کچھ اضطرار رہے
یہ جسم خاکی ہے فرسودۂ منزل حرماں
خدا کرے کہ یہ ملبوس مستعار رہے
دکھا کے آئینۂ عشق کہتی ہے حیرت
قدم قدم پہ خیالِ مآلِ کار رہے
وہی ہے واقف رمزِ حقیقتِ عالم
کہ بیخودی میں بھی سرشار ہوشیار رہے
نہ اٹھنا تھا نہ اٹھا جلوہ گاہ سے پردہ
اگرچہ محو نظارہ ہزار بار رہے

تمام عمر ٹلینگے نہ بے پئے ساقی
پلا دے ایسی کہ تا زیست کچھ خمار رہے

ہوئے نہ مائلِ پرواز ہم قفس سے کبھی
ہزار خندۂ گلُ ۔ حاملِ بہار رہے

بھلا ہو عشق کا ہم سے جو ہو سکا وہ کیا
نہ ہو سکا کہ گناہوں میں اختصار رہے

ہوا ہوں کشتۂ نیرنگیٔ فسوں لے شوق
یہ تو یہ تو میری رودادِ یادگار رہے

۱۹۴۳ء

منوّر آجکل بزم جہاں معلوم ہوتی ہے
زمینِ شعر رشکِ آسماں معلوم ہوتی ہے

شکستہ دل کی شاید داستاں معلوم ہوتی ہے
سُنو کِس کی صدائے بیزباں معلوم ہوتی ہے

دفورِ ضبطِ پیہم نے بڑھایا دردِ پنہاں کو
کہیں بجلی سی سینے میں نہاں معلوم ہوتی ہے

بہت تھا شور تیری تیز دستی کا ۔ مگر قاتل
یہ کیا تیغِ دودم ۔ کیوں نیم جاں معلوم ہوتی ہے

دھواں اٹھتا تھا پہلے روشنی دیکھو یہ کیسی ہے
کہ بجلی سی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

وہ افسردہ تمنائیں مچلتی ہیں کہ سینے میں
نفس کی آمد و شد بھی گراں معلوم ہوتی ہے

وہ اک تنویر ہے پھیلی ہوئی اقصائے عالم میں
تجلی ذرّہ ذرّہ میں نہاں معلوم ہوتی ہے

مسافت سی مسافت ہے قدم بھی اب نہیں اٹھتے
تجھے اے راہبر منزل کہاں معلوم ہوتی ہے

کھلے زخم تمنا ہیں بنا ہے پُر فضا سینہ
یہ گلکاری بہارِ بیخزاں معلوم ہوتی ہے

نہ ملتا ہے پتہ کوئی نہ راہِ جستجو پیدا
نہ کچھ بھی یادگارِ رفتگاں معلوم ہوتی ہے

نہ پوچھو کس کے ہاتھوں ہوگیا تاراج یہ گلشن
وہ اک اُجڑی سی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مے سرجوش کا ایک جام دیدے اور اے ساقی
بہت چوکھی یہ اے پیرِ مغاں معلوم ہوتی ہے

زبان موجِ صہبا کہہ رہی ہے اے چمن والو

کہ رنگِ گُل سے صنعِ باغباں معلوم ہوتی ہے
تصوّر مجھکو لے جاتا ہے اوجِ عرش پر اے شوق
میری فطرت مکینِ لامکاں معلوم ہوتی ہے

۱۹۴۲ء

دل میں ہوتی ہے خلش شاید کوئی پیکاں بھی ہے
چارہ گر آ۔ دیکھ تو اے اس کا کچھ درماں بھی ہے
ہائے طلاطم خیز موجیں بحرِ بے پایاں بھی ہے
ناخدا سوتا ہے ساحل دور ہے طوفاں بھی ہے
کیوں رہیں ضبط ہو یہ گریہ سامانیٔ چشم
آنسوؤں سے کھیلنے کو دامنِ مژگاں بھی ہے
یوں نہ پابندِ زباں ہوں آپ بزمِ ناز میں
باتوں باتوں میں شکستِ عہد و پیماں بھی ہے
دیکھ لینگے وہ تجلی جلوہ گاہِ ناز میں
جستجو کیجیے ابھی تو عالمِ امکاں بھی ہے
دردِ الفت کے مزے اے ہمنفس ہم سے تو پوچھ
سوزِ پنہاں آہِ سوزاں دیدہ گریاں بھی ہے
اُف الٹے وہ خلوت کا عالم اور اُن سے نوک جھونک

آئینہ ہے وہ ہیں اور میرا دل حیراں بھی ہے
حسرتیں ارمان اُمیدیں ہیں دل میں آبسیں
ساتھ ہی انکے یہ دیکھو یاس ہے حرماں بھی ہے
کیا ہی حسرت خیز ہے یہ دور نیرنگئی بزم
شمع جلتی جاتی ہے اور ساتھ ہی گریاں بھی ہے
سرد آہوں پر دل مجبور کی جائیں نہ آپ
یہ سمجھ لیجئے کہ دل میں شعلۂ عریاں بھی ہے
رہ رَوِ راہ لقا عجلت میں جاتا ہے کہاں
جانے والے یہ بتا کوئی سر و ساماں بھی ہے
آپ کیوں ڈرتے ہیں اتنا انتہائے جور سے
آپ کی سی کہنے والا یہ دل ناداں بھی ہے
داور محشر کے آگے سرنگوں کیوں ہے نہ شوق
ہیں خمار آلودہ آنکھیں بدنما داماں بھی ہے
۱۹۴۲ء

بتوں کے در سے اُٹھایا نہ سر کبھی میں نے
بڑھا دی حد سے فزوں شان بندگی میں نے
سکھائی چرخ کو کیا کیا ستمگری میں نے

تمام عمر دیا درس کجروی میں نے
دیارِ عشق میں کی ہے پیمبری میں نے
خدا کے گھر میں بھی ہاں کی ہے رہبری میں نے

فلک پہ نجم و مہ و مہر ہیں گواہ میرے
دیارِ حسن کی دن رات سیر کی میں نے

نہ چھیڑنا کہیں اب رہ روِ طریقت کو
جتا دیا ہے تجھے دیکھ گمرہی میں نے

نگاہیں ساقیٔ مخمور کی پھریں آخر
سکھا دیا اُنھیں جب دورِ ساغری میں نے

مثالِ سبزۂ پامال ۔ زندگی ہو بسر!
کہا تھا ۔ تجھ سے یہ کب چرخِ اخضری میں نے

تلاشِ راہِ حقیقت میں ہو گئے بیگانہ!
مجاز میں بھی رکھی شانِ بیخودی میں نے

کہاں کہاں اُسے ڈھونڈا مگر نہیں ملتی
وہ عمر جس کو کیا صرفِ بندگی میں نے

نہ پوچھو شوق کہ کیا ذوق اُس میں شامل تھا
نہ چھوڑی تا دمِ آخر یہ کافری میں نے

سنہ ۱۹۴۳ء

پہلے چتون تھی خشمگیں کیسی — آج دیکھو ہے شرمگیں کیسی
ایک قطرہ نہیں ہے مژگاں پر — ہو گئی تر یہ آستیں کیسی
دیکھا بھالا اِدھر اُدھر نہ کبھی — وہ نگہ ہو گی شرمگیں کیسی
سجدہ جس آستاں پہ ہو نہ قبول — پھر اُسی در پہ یہ جبیں کیسی
سخت جانوں سے مل چکی ہے گلے — پھر یہ شمشیر نازنیں کیسی
بیزباں دل ہی کچھ بتا دیگا — غم کی راتیں گذر گئیں کیسی
چشمِ پُرفن حیا نواز بھی ہے — شوخ اگر ہو تو شرمگیں کیسی
اے نسیمِ بہار کیا کہنا — بکھری ہے زلف عنبریں کیسی

شوقؔ الفت میں ضبط لازم ہے
لب پہ ہے آہِ آتشیں کیسی

سنہ ۱۹۴۲ء

کھوئے گئے کچھ ایسے کہ شرما کے رہ گئے
کچھ کہتے کہتے رک گئے جھنجلا کے رہ گئے
مانی نہ اُس نے ایک بھی سمجھا کے رہ گئے
تھا پاسِ حسن دل ہی کو بہلا کے رہ گئے
توبہ! شکست توبہ میں، کہی نہ کچھ کسر

ساقی کے سامنے ہمیں گھبرا کے رہ گئے

کیوں اے شمیم پھولوں پہ کیا اوس پڑ گئی
کس کی نظر پڑی کہ وہ مرجھا کے رہ گئے

شاید کسی کی یاد نے لیں دل میں چٹکیاں
آخر یہ کیا ہوا کہ وہ پچھتا کے رہ گئے

حرف غلط کی طرح نہ آیا خیال میں
خود اپنے نام کو ہمیں مٹوا کے رہ گئے

بد ظن کچھ ایسے تھے دل شوریدہ سر سے وہ
سلجھیں نہ گتھیاں انھیں سلجھا کے رہ گئے

ہچکی نہ آنے پائی کہ دم گھٹ کے رہ گیا
تار نفس میں اسکو بھی الجھا کے رہ گئے

ہر ہر قدم پہ حشر و قیامت نثار ہیں
فتنوں کو لاکھ بار وہ ٹھکرا کے رہ گئے

بسمل تڑپ رہا ہے کوئی نیم جاں کوئی
تیغ دو دم وہ آج بھی چمکا کے رہ گئے

خود ناخدا تھے کشتیٔ عمر رواں کے ہم
ساحل قریب تھا اسے ٹکرا کے رہ گئے

کیسا صلہ ملا ہے محبت میں کیا کہیں
باتیں ہزار ہم کو وہ سنوا کے رہ گئے
لب بند تھے زبان تھی خاموش پھر بھی شوق
کچھ قطرے آنسوؤں کے مگر آ کے رہ گئے

۱۹۴۴ء

مطلب نہ کچھ فنا سے نہ خواہش بقا کی ہے
بس دل کو جستجو ہے تو راہِ وفا کی ہے
نالے نہیں، فغاں نہیں، آہ و بکا نہیں
خاموش بیٹھے ہیں کہ یہ مرضی خدا کی ہے
مایوس ہو کر آئی گئی جب وہ عرش تک
آخر کہیں بھی حدِ سماعت دعا کی ہے
گم بیخودیٔ شوق نے عالم سے کر دیا
ڈھونڈے سے مل بھی جاؤں تو قسمت قضا کی ہے
دستِ سوال بھی تو وہ پھیلا کے رہ گیا
حالت یہ دیکھنا تیرے در کے گدا کی ہے
فریادِ بے زباں ہوں گلہ کی نہیں مجال
خود اپنے دل سے پوچھو جو شہرت جفا کی ہے

دشتِ جنوں ہے سامنے اُٹھتے نہیں قدم
اب ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے

کس کام آئیں گی تیری محشر خرامیاں
بستی زمانے بھر میں یہ اہلِ وفا کی ہے

نزدیک تر ہوں منزلِ عرفاں سے اور دور
سنتا ہوں میں وہاں گذر اہلِ وفا کی ہے

کس لطف سے گذرتی ہے اُف کیفِ بیخودی
پروا کب ہم کو پرسشِ روزِ جزا کی ہے

ناکامیوں نے کام کا رکھا نہ دہر میں
حالت سکوت و جذب میں بیم و رجا کی ہے

روداد غم ہے آہ و فغاں کا پتہ نہیں
فریاد سن تو لیجئے کس بے نوا کی ہے

زنجیرِ عرش جا کے ہلا دی یہ کس نے شوق
کوئی اگر خطا ہے تو آہ رسا کی ہے

۱۹۴۳ء

آخر کو حالِ پُر غم کہنا ہے تو اُنھیں سے
کچھ باتیں آؤ کر لیں پہلے دلِ حزیں سے

پہلو میں دل کو ڈھونڈا آنکھوں سے حال پوچھا
لائیں گے اس کے ٹکڑے چن کر ہمیں کہیں سے
بگڑا نہ کچھ کسی کا دیکھا کئے تماشا
اپنے ہی گھر کو پھونکا ایں آہ آتشیں سے

پہلو میں دل ہے پر ہم کیا جانے کیا ہوا ہے
کیونکر نباہ ہوگا روٹھے ہوئے مکیں سے
کاٹی ہے ہجر کی شب پہلو بدل بدل کر
سوغات یہ ملی ہے ہم کو دل حزیں سے
آئیں گی میٹھی نیندیں تا روز حشر کیونکر
پالا پڑا ہے اپنا ایک تنگ تر زمیں سے
دیکھیں گے رنگ حسن و عشق مجاز کب تک
وہم و گماں بدل دیں کس طرح ہم یقیں سے
آنکھوں سے اشک بہکر پلکوں پہ آگئے ہیں
دامن میں رکھ لو موتی پوچھو نہ آستیں سے
لائے ہیں ڈھونڈ کر ہم کھوئے ہوئے اثر کو
سجدہ مگر ہو کیونکر چھوٹی ہوئی جبیں سے
وہ دل جدا ہے ہم سے برسوں کا تھا جو مونس

خود ہم بھی اب خفا ہیں اے شوقِ ہمنشیں ہے

۱۹۴۴ء

یہ وہ دل ہے جو نہیں مائلِ فریاد کبھی
امتحاں کر تو سہی اے ستم ایجاد کبھی

یوں نہ رہتا کبھی ہنگامۂ یاس و حرماں
ساتھ تو نے نہ دیا اے دلِ ناشاد کبھی

آپ کتنے قیدِ تعین میں خبر تک نہ ہوئی
حیف حامی نہ ہوئی فطرتِ آزاد کبھی

دل رہا اُن کی جفاؤں سے ہمیشہ محروم
نہ ہوئے پر نہ ہوئے مائلِ بیداد کبھی

آنکھوں نے دیکھے ہیں کیا کیا نہ فلک کے فتنے
تازہ ہنگامہ کوئی عالم ایجاد کبھی

ہمصفیران چمن بھول گئے تم ہمکو
ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

لاکھوں برباد ہوئے خاک ہوئے مٹ بھی گئے
نہ ہلی پر نہ ہلی عشق کی بنیاد کبھی

افسوں ساز تجھے یاد ہے یا بھول گیا

تجھ سے مانگی تھی ہمیں نے کوئی بیداد کبھی

باغباں تجھکو دکھا دیتے عروجِ پرواز
چھوٹتا ہم سے اگر خانۂ صیاد کبھی

موجدِ طرزِ نوی لاکھ ہوں لیکن صد حیف
نہ ملی فکرِ رسا طبع خدا داد کبھی

ایک سی حالتِ دل دیکھی نہ ہمنے اے شوقؔ
ہے کبھی محوِ طرب خوگرِ فریاد کبھی

۱۹۴۴ء

جو ہے ہونا وہی تو ہوتا ہے — کس لئے بد نصیب روتا ہے
رات فرقت کی کٹ گئی جوں توں — پھر نہ جانے یہ کون روتا ہے
بن پڑے کچھ تو کیجئے نیکی — یوں ہی دنیا میں نام ہوتا ہے
ہو نہ ہو ہے کوئی تھکا ماندہ — پاؤں پھیلائے کب سے سوتا ہے
لب پہ آتا نہیں ہے نام خدا — جبکہ صہبا و جام ہوتا ہے
شاخِ گل کو جھکا کے اے گلچیں — کانٹے کیوں اپنے حق میں بوتا ہے

منزلِ عشق دور ہے۔ اے شوقؔ
کس لئے اپنی جان کھوتا ہے

۱۹۴۴ء

کہانی کیا سنو گے داغہائے سوزِ ہجراں کی
ادھر دیکھو میں اک تصویر خود ہوں یاس و حیرانکی

کہاں ہے تاب نظارہ غشی کا ایک عالم ہے
تجلی دیکھئے کیونکر نقابِ برقِ ساماں کی

نہیں معلوم ہے دیوانگی کا ماحصل کیا ہو
سبق آموز ہے حالت میرے چاکِ گریباں کی

کہیں کیا دستِ واماندہ نے کیسا کردیا مجبور
رہینگی دور اب کب تک حدیں چاکِ گریباں کی

کبھی ترچھی کبھی ترچھی کبھی شرما کے جھکتی ہے!
بلائیں شوخیاں دیکھو نگاہِ فتنہ ساماں کی

کھٹک ہے ٹیس ہے پُر سوز آہِ بے اثر بھی ہے
یہ ہے اک مختصر روداد میرے دردِ پنہاں کی

انھیں آنکھوں نے دیکھا تھا نظامِ محفلِ رنگیں
جواب حالت ہے وہ بھی دیکھ لی بزمِ پریشاں کی

نظر آتی ہے سونی سی ابھی سے بزمِ انجم حیف
نہ جانے صبح کب ہوگی ہماری شامِ ہجراں کی

ضیائے نور کا ظلمت کدہ میں دخل کیا ہمدم

یہ کیا اندھیر ہے تخیر ہو شمع شبستاں کی
نہ پوچھا داں کسی نے تازہ مہماں کون آیا ہے
سمجھ میں کچھ نہ آئی رسم یہ شہر خموشاں کی
تماشا گاہ محشر میں ترا دیوانہ جا نکلا
نہ سدھ بدھ تھی اُسے اپنی نہ پروا جیب ودامانکی
ہمیں اے شوق ایسا خاکساری میں ملا رتبہ
ہوا کو بھی اُٹھانے دی نہ گرد اپنے بیاباں کی

۱۹۴۷ء

پلائی ساقی نے ایسی کہ بیہشی نہ رہی
بھٹکتے پھرتے کہاں تک وہ گم رہی نہ رہی
وہ خود سری نہ رہی اور وہ ہمسری نہ رہی
ہزار شکر کہ دل کی وہ سرکشی نہ رہی
نظام بزم میں ہل چل سی کچھ پڑی لیکن
نگاہِ شوق کے ملتے ہی برہمی نہ رہی
کجا وہ بارگہ ناز اور کجا یہ بزم مجاز
دیارِ عشق میں پہونچے تو یہ خودی نہ رہی
لگی ہوئی تھی لبوں پر تو ایک مُہر سکوت

زباں پہ آتے ہی نام اُس کا خامشی نہ رہی

مٹا یا دل کو کسی پُر جفا نے کچھ ایسا!

وہ ایک پیکرِ خاکی تھا خاک بھی نہ رہی

وہی ہے ساقیٔ مہوش وہی ہے پیمانہ

مگر وہ دور نہیں اور وہ میکشی نہ رہی

یہ دور دور مسلسل یہ انقلاب جہاں

ہزار حیف وہ اگلی سی رہ بری نہ رہی

نہ سازِ عشق وہ اب ہے نہ زخمہ زن ہے کوئی

خدا گواہ ہے پہلی سی زندگی نہ رہی

جہاں میں ہو گئے پیدا نئے نئے انداز

طریقِ عشق میں وہ طرزِ سرمدی نہ رہی

جفا و جور ستم پر ستم کیے تو نے

ہمارے حق میں کسی طرح کی کمی نہ رہی

وہ ولولے وہ جوانی وہ شوق کا عالم

وہ زندگی جسے کہتے ہیں زندگی نہ رہی

دفورِ شوق میں سب عالمِ شباب گیا

وہ اُنکی جور و جفا شانِ دلبری نہ رہی

کمالِ عشق ہیں حاصل ہوا ہمیں اے شوقؔ
لگی جو دل میں تھی وہ دل میں اب لگی نہ رہی

۱۹۴۴ء

کیسا دورِ گردشِ ایام ہے
جس کو دیکھو خوگرِ آلام ہے
دائمہ ہے ہستیٔ ناپائیدار
زندگی مجموعۂ اوہام ہے
بیخودی ہیں امتیازِ حُسن کیا
ہوش کی پی۔ کیا خیال خام ہے
چونک اُٹھے۔ جتنے تھے مرغانِ چمن
یہ صدائے نالہ بے ہنگام ہے
ساز و ساماں بیکشوں کا کچھ نہ پوچھ
ایک ساغر ایک ٹوٹا جام ہے
جس کو پینا ہو وہ آئے شوق سے
میکدے میں یہ صدائے عام ہے
ضبط ہو سکتی نہیں آہ و فغاں
قلب مُضطر مفت میں بدنام ہے

چھوڑ کر دیر و حرم ہم چل دیئے
جذبِ کامل کا یہی انجام ہے

حرمتِ بتخانۂ دل مجھ سے پوچھ
نور افشاں جلوۂ اصنام ہے

جس کو ٹھکرایا زمانے بھر نے شوق
یہ وہی میرا دلِ ناکام ہے

پردہ اُٹھ جاتا ہے خود ہی دل سے شوق
یہ کمالِ عشق کا انجام ہے

۱۹۴۶ء

اگر اے شوق بے پردہ جمالِ یار ہو جائے
فضا کا ذرّہ ذرّہ مطلعِ انوار ہو جائے

اگر پیشِ نظر وہ حسنِ آفت کار ہو جائے
ابھی جینا ہی مشکل مرگ بھی دشوار ہو جائے

جنوں کے جوش میں زنجیر کا لنگر ہو دامن میں
کہ دیوانہ بکارِ خویشتن ہشیار ہو جائے

بہارِ چشمِ تر کا یا الٰہی تو بھرم رکھنا
کہ شبنم کی طرح ہر اشک گوہر بار ہو جائے

دلِ شوریدہ سر گھبرا گیا ہے یہ سکوں کب تک
وہ تمکینِ جنوں اے کاش پھر بیدار ہو جائے

نہ آنسو ہیں نہ نالے ہیں نہ آہ سرد ہی لب پر
بتا کیوں کر تیری تسکیں دلِ بیزار ہو جائے

شب تاریک بیم موج گرداب چنیں حائل
خدا ہی ہے جو بحرِ غم سے بیڑا پار ہو جائے

دل سوداز دہ جا پہونچے اُس حد تک تو کیا کہنا
جہاں اندازۂ جوش جنوں دشوار ہو جائے

بدل سکتی ہے دل کی ماہیت دم بھر میں اے ہمدم
عجب کیا ظلمتِ دل مظہر انوار ہو جائے

اُسے ہوتی ہے مر مر کر حیاتِ جاوداں حاصل
ہے اُس کی زندگی جینے سے جو بیزار ہو جائے

کہاں تک شوق کیجئے انتظار جلوۂ رعنا
نہو دیر و حرم لیکن کہیں دیدار ہو جائے

۱۹۴۶ء

آن پڑی جب سر پہ اپنے ہنسنا ہنسانا بھول گئے
جوش وحشت اور بڑھا تو رونا رُلانا بھول گئے

اپنی اپنی سب کو پڑی تھی ہم کو جگانا بھول گئے
کیسا دھوکہ کھایا ہم نے اپنا ٹھکانا بھول گئے

رحمتِ حق پر نازاں تھے پردہ غفلت حائل تھا
فردگنہ کو دیکھا تو نام ہٹانا بھول گئے

خواب میں جانے کیا کیا دیکھا کوئی تماشا یاد نہیں
سوتے سوتے آنکھ کھلی جب۔ شور مچانا بھول گئے

آتے جاتے دیکھا ہوتا کھویا ہوا اِک راہ میں ہے
اک سڑی سودائی کو ہوش میں لانا بھول گئے

چلنے کی کچھ ایسی دُھن تھی منزل رہ گئی دور کہیں
تیز روی نے رستہ کھویا راہ پر آنا بھول گئے

ہوتا کو آتے دیر نہ لگتی اس میں تساہل اپنا تھا
اور جو دھندے سامنے آئے اس کو بلانا بھول گئے

ہم سے بلاکش ڈھونڈے سے ملتے کہاں ہیں دنیا میں
آفت پر گو آفت آئی جان گنوانا بھول گئے

پاس ادب کے رونے نہ پائے جی بھر ملنے کا کیسے ہوتا
دل کی حالت کہتے کہتے اشک بہانا بھول گئے

جائزہ دینے حشر میں پہونچے عالمِ حیرت طاری تھا

دامن تر پر سب کی نظر تھی اُس کو چھپانا بھول گئے
شوق نے اپنی عظمت کھوئی جب سے تم نے رُخ نہ کیا
دیکھا دیکھی اندر دل کی وہ قشقہ لگانا بھول گئے

۱۹۴۴ء

وہاں ہیں ہم جہاں آسودگی معلوم ہوتی ہے
یہ تکمیل جنوں کی رہبری معلوم ہوتی ہے
یہ مایوسی بہارِ زندگی معلوم ہوتی ہے
مصیبت کا سہارا بے بسی معلوم ہوتی ہے
حیاتِ چند روزہ پر ہے نازاں بحرِ ہستی میں
حباب آسا یہ موجِ زندگی معلوم ہوتی ہے
دلِ آشفتہ کیا اُٹھ کر گیا ہے بزمِ رنگیں سے
یہ کیسی انجمن میں برہمی معلوم ہوتی ہے
وہ اب تک بےخبر ہیں سوزِ نہاں کس کو کہتے ہیں
یہ آہِ پُر شرر کی کچھ کمی معلوم ہوتی ہے
بہت مدت میں ساقی یہ ہوا اندازہ مستی
شریکِ دورِ صہبا بےخودی معلوم ہوتی ہے
عجب انداز سے ہے جلوہ گر چشمِ تصور میں

یہ شاید ابتدائے بیخودی معلوم ہوتی ہے

فلک پر ماہ و انجم رونقِ محفل تو ہیں لیکن
سراپا حسن کی بے پردگی معلوم ہوتی ہے

کہاں جنجال دنیا کا کہاں نیرنگئ قسمت
مگر کچھ ہوا سی میں دل کشی معلوم ہوتی ہے

سمجھنا کچھ نہ نقادِ شعور رازِ عالم امکاں
مگر فطرت کی کچھ ہمسائیگی معلوم ہوتی ہے

کسی کا آستانہ اور ہم ہوں شوق سجدے ہیں
یہی ہم کو تو شانِ بندگی معلوم ہوتی ہے

۱۹۴۴ء

زباں پر دیکھئے لائے نہ لائے خامشی اپنی
بنے گی ترجمانِ دل نگاہِ آخری اپنی

بنا دیگی ہمیں مخدومِ عالم عاجزی اپنی
زمینِ آستاں اپنی جبین و بندگی اپنی

یہ اعجازِ محبت چشمِ حیرت سے کوئی دیکھے
در آئے کارواں آخر ہوئی خود گمرہی اپنی

یہ رازِ بیخودی وہ ہے ہمیں جس کو سمجھتے ہیں

ہر آئینہ دکھا دیتی ہے چشمِ حیرتی اپنی

قدم ہر ہر قدم پر ڈگمگاتے ہیں طریقت میں
کسی کی جستجو میں پھر رہی ہے بے بسی اپنی

مقامِ ہو تک آپہونچے ہیں آگے کا خدا حافظ
کہاں لیجائیگی اب دیکھنا ہے خودسری اپنی

اُمید و بیم کا نظارہ ساحل سے دکھا دیتے
طلاطم خیز موجوں سے جو کشتی کھیلتی اپنی

کسے تھا اعتبار حق و باطل جوش وحشت میں
سمجھتے تھے ابھی تک ہم خودی کو بیخودی اپنی

کبھی مجھ بے سروساماں سے آخر پوچھ تو لیتے
ملائی خاک و خوں میں کس لئے خود زندگی اپنی

مشہیر نامور نے وہ پلائی بادۂ سرجوش
نرالی میکدہ میں ہے یہ طرزِ میکشی اپنی

چلو مدت کا جھگڑا چک گیا ذوق دم بھر میں
کہی جو کچھ کہ کہنا تھی سنائی کچھ سنی اپنی

۱۹۴۴ء

لاکھ ڈھونڈا نہ ملے تار گریبانوں کے

ٹکڑے ہاتھ آ گئے کچھ دشت میں دامانوں کے

بے زباں ایسا زمانے میں نہ دیکھا نہ سُنا
رہتے خاموش ہیں کیوں چاک گریبانوں کے

دیکھنا دستِ جنوں پنجۂ وحشت کی قسم
نام لیوا ابھی باقی ہیں گریبانوں کے

رہ گئیں جانے کہاں شام غریباں والے
رہنے والے کبھی ہم بھی تھے شبستانوں کے

ہیں خطاوار تمہارے ہی یہ تیر نادک
زخم گہرے نظر آتے نہیں پیکانوں کے

تیرے بیگانۂ در ہو کے ٹھکانا نہ ملا
کیا قدم آگے بڑھیں اب انھیں دیوانوں کے

جل بجھوں کے ہیں وہی یاد دلانے والے
سوختہ پر جو ملے بزم میں پروانوں کے

چند اوراق بظاہر ہیں پریشاں لیکن
کئی عنوان ہیں ان میں میرے افسانوں کے

شوقؔ دبدھا میں بھلا تم بھی رہو گے کب تک
اب تو ڈھنگ بدلے ہیں کچھ زود پشیمانوں کے

۱۹۴۴ء

ستم رسیدہ دلوں کا کچھ اعتبار رہنے دے
یہ امتحانِ جفا بار بار رہنے دے

اگرچہ دل سی ہی شئے داغدار رہنے دے
یہی ہی ایک میری یادگار رہنے دے

اسی میں چین ہی کچھ بیقرار رہنے دے
بہ شرطِ تاب و سکوں غمگسار رہنے دے

اُمید کم ہی کہ ہوگا شمارِ فردِ عمل
جھکی ہوئی ہی جبیں شرمسار رہنے دے

پلائے جا مجھے ساقی وہ بادۂ پُرجوش
کہ ہوش بھی رہے اور کچھ خمار رہنے دے

ہم ایسے نیند کے ماتوں کو کیا جگاتی ہے
یہ ٹھنڈے جھونکے نسیمِ بہار رہنے دے

میرے ہی سامنے گلچیں نے باغ لوٹا ہے
مجھے تو کوئی یونہی سوگوار رہنے دے

مچل مچل کے پلائی ہے ساقیا تو نے
ذرا سی دیر تو مستِ خمار رہنے دے

ملا ازل میں جو دل ہی وہ خوگرِ غم و درد
کسی کے بس کا نہیں بیقرار رہنے دے

بجھیں نہ دیدۂ پرنم سے سوزشیں دل کی
سزا یہ ہی کہ انہیں اشکبار رہنے دے

کبھی سے طالبِ عفو و عطا ہے شوقِ حزیں
میری خطاؤں کو آمرزگار رہنے دے

۱۹۴۴ء

یہ جانے عشق میں کس کس سے ملتجی ہوگی
سہارا ڈھونڈتی ہر سمت بیکسی ہوگی

چلو بتائیں کہ کس جا وہ بیکسی ہوگی
کہیں وہ شامِ غریباں میں جا چھپی ہوگی

ہزار آپ تجاہل سے کام لیں لیکن
یہ سرگذشتِ حقیقت کہیں سنی ہوگی

خدا کرے کہ گزر جائے زیر سایۂ تیغ
زمانہ بھر سے نرالی یہ زندگی ہوگی

نیاز مندئ حسرت کشاں کا ذکر ہی کیا
نہ جانے عشق میں کیسی یہ بندگی ہوگی

کہاں ہیں عالم امکاں کو چھوڑ کر جاؤں
کہیں بھی جاؤں ہر اک ساتھ بیخودی ہوگی

نہ پوچھئے دلِ شوریدہ کس لئے چپ ہے
چھپی ہوئی کسی پردے میں بے بسی ہوگی

ہنسی خوشی سے چلے ہیں اجل کو ساتھ لئے
کسے خبر ہے کہاں موت و زندگی ہوگی

ہے ابتدائے جنوں آگے دیکھئے کیا ہو
ابھی تو بیخودیٔ! عشق بے کلی ہوگی

غرور حسن اُدھر ہے - تو عشق بے پروا
مزے کی دونوں میں باہم کشاکشی ہوگی

خبر کسے کہ ہے شیشے میں بادۂ سرجوش
عجب ہے۔ ساقی نے کس طرح کیا بھری ہوگی

اُٹھائے صدمہ پہ صدمے فراق میں اے شوق
کہاں نصیب کسی کو یہ زندگی ہوگی

۱۹۴۳ء

سحر سے تکتے تکتے اب یہ مہرِ کردگار آئی
جگر دل کیوں نہ آنکھوں میں کہ شام انتظار آئی

عجب انداز سے بادِ سحر مستانہ وار آئی
ذرا پوچھو تو اُس سے کیا چمن میں وہ پکار آئی

فدا تجھ چمن والو تیں دونوں ہی یکساں ہیں
تسلسل کس مزے کا ہے خزاں گذری بہار آئی

ہم آغوشئ شاخِ گل سے کھل جاتا ہے ہر غنچہ
نسیم صبح اُنکو چھیڑنے کیوں بار بار آئی

پہنچنا تھی وہ پہونچی ٹھوکریں کھاتی ہوئی آخر
بہت آئی جو ہم تک سا زندگی مستعار آئی

دعائے بے اثر کا آجتک ثمرہ نہیں پایا
کبھی مرہونِ مایوسی کبھی وہ شرمسار آئی

اسیرانِ قفس صیاد کب تک دل کو بہلائیں
سُنا کرتے ہیں مدت سے بہار آئی بہار آئی

مریضِ غم کی حالت پوچھتے کیا ہو طبیبوں سے
لبوں پر جب پیام مرگ لیکر جان زار آئی

گلے مِل مِل کے ارمانوں نے جب رخصت کیا اُس کو
لبوں پر سسکیاں بھرتی وہ آہ سوگوار آئی

بھری محفل میں دل نے کھو دیا اپنا بھرم اے شوقؔ
مگر کچھ کام آئی تو نگاہِ شرمسار آئی

سنہ ۱۹۴۰ء

اے جنوں آج دکھا کارنمایاں کوئی
ڈھونڈ لا جا کے کہیں تار گریباں کوئی

سیر چشمی تیری اے دیدۂ تر کیا وہ ہوئی
حیف قطرہ بھی نہ آیا سر مژگاں کوئی

جذبہ جامہ دری تجھ کو ہے وحشت کی قسم
دیکھ ثابت نظر آئے نہ گریباں کوئی

بات کی بات تھی میں نے تو کہا کچھ بھی نہ تھا
خود بخود ہو گیا خود کردہ پشیماں کوئی

واہ ری گردشِ افلاک تیرا کیا کہنا
دم بخود ہے کوئی گریاں کوئی نالاں کوئی

وہ بھی ہے درد کہ جس میں کوئی احساس نہ ہو
ہے مزہ دل میں کھٹکتا رہے پیکاں کوئی

گردش چرخ و زمیں دونوں نے مل کر پیسا
غم کا مارا ہے کوئی کشتۂ حرماں کوئی

ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں کب سے اے شوقؔ
کاش بھر دے گُلِ مقصود سے داماں کوئی

سنہ ۱۹۴۰ء

ہماری خامشی کو وہ ادائے بیزباں سمجھے
نگاہ یاس کی آخر نہ کچھ بھی داستاں سمجھے

ہمیشہ سے دلِ آوارہ کو بے خانماں سمجھے — جو لوٹ آیا تو اسکو اک بلائے ناگہاں سمجھے
پتہ ملتا نہیں گلشن میں اپنے آشیانے کا — کسی کا آشیاں ہو اسکو اپنا آشیاں سمجھے
نگاہیں چار ہمکو پر عجب حالت ہوئی دل کی — وہ ہمکو بیزباں سمجھے ہم انکو بدگماں سمجھے
الٰہی وہ اثر پیدا ہو میری آہ و زاری میں — نہ کچھ میں اُسکی سمجھوں اور نہ وہ میری فغاں سمجھے
چمن میں ہمصفیرانِ چمن کے ہمنوا ہم تھے — جدا تو نے کیا تجھسے خدا اے باغباں سمجھے
دلِ حسرت زدہ تھا اور ہم تھے اور رسوائی — وہی دشمن نظر آیا کہ جس کو رازداں سمجھے
درِ بتخانہ جب دیکھا جھکا سجدے میں سر اپنا — یہ تھا ذوقِ جبیں سائی کہ تیرا آستاں سمجھے
سمجھ کا پھیر اس کو کہئے یا کوتاہیٔ قسمت — بلائیں آئیں پر انکو نصیبِ دشمناں سمجھے
زمین و آسماں دونوں نے ہمکو پیس ہی ڈالا — زمیں پر رہنے والو ہم تو دورِ آسماں سمجھے
کچھ ایسے درد سے رو دیا دلِ محوِ ناکامی — کہ سننے والے اسکو اک صدائے الاماں سمجھے

نجانے لے گیا جوشِ جنوں ہم کو کدھر اے شوق
نہ ہم عرشِ بریں سمجھے نہ ہم کون و مکاں سمجھے

سنہ ۱۹۴۰ء

غمِ پیہم کی کلفت جزوِ فطرت ہوتی جاتی ہے — دلِ دردآشنا یہ کیا مصیبت ہوتی جاتی ہے
بہت چاہا تھا ہم نے ناصحا دل کی بہل جاتی — مگر سمجھائیے تو اور وحشت ہوتی جاتی ہے
زمانہ منحرف ہو یا کہ ہو ناکامیٔ قسمت — بہر صورت یہ تکمیلِ محبت ہوتی جاتی ہے
کسی کی سرگذشتِ غم سے کیا حاصل نہیں ہو گا — خود اپنے دل کے افسانے سے عبرت ہوتی جاتی ہے

زمانہ عالمِ باطل کے جلووں پر ہی وارفتہ
مگر میں ہوں کہ مجھ کو اور حیرت ہوتی جاتی ہے

تمنا آرزو حسرت امید ارماں کے رہنے سے
میرے کاشانۂ دل کی بھی زینت ہوتی جاتی ہے

اسیرانِ قفس کیونکر کٹے گی زندگی اپنی
کہ بوئے گل چمن زاروں سے رخصت ہوتی جاتی ہے

چلو اے ہمنوایانِ چمن صحرا کو دیکھ آئیں
شنا سا کچھ ہماری شامِ غربت ہوتی جاتی ہے

ادھر آنا ذرا اے تیرِ نگاہ ناز ادھر آنا
جگہ دو رنج کو بھی دل میں یہ وسعت ہوتی جاتی ہے

یہ ہی حسنِ تصور شوق یا جذبہ بصیرت کا
کہ نظروں میں نمایاں ایک صورت ہوتی جاتی ہے

سنہ ۱۹۴۵ء

دل انھیں دیکھ کے دیوانہ ہوا جاتا ہے
دونوں عالم سے یہ بیگانہ ہوا جاتا ہے

ظرفِ عالی دلِ پرخوں کا یہ دیکھے کوئی
دستِ ساقی میں وہ پیمانہ ہوا جاتا ہے

ہر قدم بے پئے ساقی تری آنکھوں کی قسم
باعثِ لغزشِ مستانہ ہوا جاتا ہے

جلوۂ حسن یہ کیا آگ لگا دی تو نے
دل کسی شمع کا پروانہ ہوا جاتا ہے

بیخودی میں دلِ سرشار کا عالم دیکھو
کیفِ ساقی سے یہ میخانہ ہوا جاتا ہے

انقلابِ دلِ وحشت زدہ کا حال نہ پوچھ
کہ یہ دیوانہ بھی فرزانہ ہوا جاتا ہے

ڈھونڈ لیں گے انھیں جلووں میں کسی کا جلوہ
کعبۂ دل ہے کہ بتخانہ ہوا جاتا ہے

دل سے پوچھے کوئی آغازِ جنوں کا انجام
ہوش میں ہو کے یہ دیوانہ ہوا جاتا ہے

کسی محرومِ تمنا کی نہ سنیے - روداد
کیا کہیں قصۂ بیگانہ ہوا جاتا ہے

دل کو تھا شوق کبھی نغمۂ غم سے اے شوق
اب وہ ہر ساز سے بیگانہ ہوا جاتا ہے

۱۹۴۵ء

داغِ دل ہم سے کسی طرح دکھائے نہ گئے
اور مجبور بھی یوں تھے کہ مٹائے نہ گئے

ہو کوئی بات ٹھکانے کی تو میں مان بھی لوں
دیجئے دھوکے کسی اور کو آئے نہ گئے

بیخودی کا تھا وہ عالم کہ الٰہی توبہ
ہم سے دیوانے کبھی ہوش میں پائے نہ گئے

دامن و جیب و گریباں کی بھی کرتے توقیر
ایسے آدابِ جنوں ہم کو سکھائے نہ گئے

ضبطِ اُلفت نے کچھ ایسا ہمیں مجبور کیا
واقعاتِ دلِ شوریدہ سُنائے نہ گئے

آہ تک جس نے نہ کھینچی۔ نہ کیا شکوۂ غم
ایسے معصوم تو دنیا میں ستائے نہ گئے

ضبطِ گریہ کا کبھی راز نہ کھلتا لیکن
اشک رنگیں تھے جو پلکوں سے چھپائے نہ گئے

لوگ کہتے ہیں کہ ہو نغمۂ نو کی تقلید
بے سُرے راگ جہاں میں کبھی گائے نہ گئے
ٹھنڈی سانسوں نے بھی دم توڑ کے منہ موڑ لیا
شعلے اُٹھتے ہی رہے دل میں بجھائے نہ گئے

واہ رے اوجِ تصور - ترا اوجِ پرواز
دو جہاں زیرِ نظر تھے کہیں آئے نہ گئے
مرہٹوں گا وہ پتہ دیتے ہیں اب تک اے شوق
کچھ نشاں ہیں کہ زمانے سے مٹائے نہ گئے

۱۹۴۰ء

سُن لیجئے غریب کا آخر سوال ہے
دشواریاں ہزار ہیں اور عرض حال ہے
دُنیا ہے اور حسرتِ ناکامیٔ مراد
دل ہی کہ بارِ زیست بھی اس پر محال ہے
ہم ایسے خوگرانِ مصیبت کے واسطے
شامِ شبِ فراق بھی صبحِ وصال ہے
بھر دے شرابِ عشق سے پیاسا ہوں ساقیا
پہلو میں دل نہیں یہی جامِ سفال ہے
در ماندگانِ عشق کی دشواریاں نہ پوچھ
کچھ حاجتِ بیاں نہیں صورت سوال ہے
وحشت کا ہو بھلا کہ ٹھہرتے نہیں قدم
ورنہ جنوں میں کانٹوں پہ چلنا محال ہے
خاموش کب سے بیٹھے ہیں دیوانگانِ عشق
لیکن وہی ہے دھن وہی جوشِ خیال ہے
اے موجِ بحرِ عشق نہ مجھکو ڈبو ابھی
میں جسمیں غرق ہوں وہ کسی کا خیال ہے

کیا شوقِ دل شکستہ سے واقف نہیں ہیں آپ
بلبل ستم رسیدہ و آشفتہ حال ہے

۱۹۴۵ء

دل محوِ عشقِ شاہدِ عکسِ جمال ہے
امکاں ہے اور وسعتِ وہم و خیال ہے

دل دردآشنا تو جگر دردمندِ دل
دو بھر ہیں جاں پڑی ہجر کر جینا محال ہے

دل ہے شکارِ رنج و ستم ہائے روزگار
احساسِ غم نہ ہو تو حدِ کمال ہے

دنیا میں رہ کے عشقِ حقیقی کہاں نصیب
مجبور ہوں کہ جذبۂ دل لازوال ہے

کون و مکاں کی سیر کا افسانہ کیا کہیں
اب ہم ہیں اور گرمیٔ بزمِ خیال ہے

قدموں پہ رکھ دیا ہے کسی نے سرِ نیاز
ٹھکرا دو اس کو شوق سے کیا قیل و قال ہے

آخر دلِ حزیں کی زباں پر کچھ آ گیا
سنئیے صدائے سازِ الم بے مثال ہے

ملتا ہے شوق خستہ جگر ننگ انجمن
یہ کُن رہ پیرِ میکدہ دیرینہ سال ہے

۱۹۴۵ء

نرگس بتا کہ نکہتِ گلشن کدھر گئی
وہ کیا گئی کہ حسرت خوابِ سحر گئی

جاتے ہی دل گئے آہ بھی کیا بے اثر گئی
وہ کیا گیا کہ شورشِ شام و سحر گئی

پانی سمجھ کے اشک کو تو نے بہا دیا
اے چشم تیرا کیا گیا آبِ گہر گئی

تھا بیکسی کا آسرا وہ بھی نہیں رہا
اچھا ہوا کہ زحمتِ زادِ سفر گئی

چاروں طرف تھے رقص کناں ذرہ ہائے نور
حیرت زدہ نگاہِ بصیرت جدھر گئی

کیا میری طرح تو بھی تھا محوِ تصورات
اے مرغ آج کیا ہے کہ بانگِ سحر گئی

زلفِ رسا کی دیکھئے نازک خرامیاں
شانے سے کھلی دوش پہ آ کر بکھر گئی

آیا نہ کچھ زباں پہ جھکا خود سرِ نیاز
بگڑی ہوئی جو بات تھی اب وہ سنور گئی

جلوے کسی کے پردے سے نکلے نہ بے نقاب
جب جلوہ گاہِ ناز پر عریاں نظر گئی

توبہ کے بعد جام نہ ساقی سے مل سکا
پچھتا رہا ہوں مستیٔ شام و سحر گئی

ہو لیتے ہم بھی ساتھ ترے اے انیسِ قید
مدّت ہوئی کہ ہمّتِ بے بال و پر گئی

اب ڈھونڈتے کہاں ہو شمیمِ چمن کو شوق
اس کو تو ساتھ لے کے نسیمِ سحر گئی

سنہ ۱۹۴۶ء

طالبِ دید ہوں پھر کس لئے پردہ مجھ سے
چھپ کے جائیگا کہاں حسنِ خود آرا مجھ سے

دل حسرت زدہ کا روگ یہ کہنا مجھ سے
روٹھی جاتی ہے یہ جاتی ہوئی دنیا مجھ سے

وہ مرے پیشِ نظر اُس کی نگاہیں مجھ پر
جانے کیا کہتا ہے یہ ڈوبتا تارا مجھ سے

بے خبر ہوش میں آ مائل عصیاں کب تک
بگڑی جاتی ہے یہ سدھری ہوئی عقبیٰ مجھ سے

المدد پائے طلب تیز ہو کچھ اور ابھی
چھوٹ جائے نہ کہیں دامنِ صحرا مجھ سے

ہے نہ یارائے فغاں اور نہ تابِ شیون
اور اب چاہتا کیا ہے دلِ رسوا مجھ سے

سر میں سودائے جنوں دل میں ہے دردِ سوزاں
مول لے لے کوئی سستا سا یہ سودا مجھ سے

اُف رے وہ طرزِ تغافل وہ نگاہِ تمکیں
پوچھتے ہیں وہ مرے دل کی تمنا مجھ سے

اُس کی شوخی وہ تبسم وہ فسوں سازیٔ چشم
کہہ گئی ایک اشارہ میں وہ کیا کیا مجھ سے

کچھ مدد لینی ہے تکمیلِ جنوں میں اُس سے
منحرف ہو نہ ابھی دل سا شناسا مجھ سے

عمر کس طرح کٹی ذوقِ خودی میں اے شوق
کچھ کہا ہی نہیں جاتا یہ فسانا مجھ سے

۱۹۴۵ء

دھندلا سا نقش تھا ہستی کا مٹا کر اُٹھے
یادِ ماضی کو بہر حال بھلا کر اٹھے

خم پہ خم عالمِ مستی میں لنڈھا کر اُٹھے
جھک گئے آپ بھی اوروں کو جھکا کر اٹھے

حالِ آزارِ محبت کا جتا کر اُٹھے
جب نہ کچھ اور بنی حشر اٹھا کر اٹھے

جذبۂ دل ہے نہ اب کوئی تمنا باقی
مٹ گئے آپ بھی دل کو بھی مٹا کر اٹھے

کوئی سنتا ہی نہ تھا سوزِ دروں کی روداد
آخر اشکوں سے لگی دل کی بجھا کر اٹھے

کون تھا میکدۂ عشق میں ہم سا مے نوش
فیضِ ساقی تھا کہ ہم پیاس بجھا کر اٹھے

کوئی دیکھے تو ذرا انکی ادائے بیباک
جب وہ پہلو سے اٹھے درد اٹھا کر اٹھے

یہ نہ سمجھے تھے کہ پر درد ہے اپنی روداد
خود تو روتے ہی تھے ان کو بھی رلا کر اٹھے

حاسدوں کا یہ بھی دستور زمانے میں رہا
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے

ہم نے یوں بارِ ندامت کیا ہلکا اپنا
دامنِ تر تھا اُسے خود ہی سکھا کر اُٹھے

کیا خبر اُنھیں کیا شوق کے دن گذری
کچھ نہ بولے مگر آنکھیں وہ سجا کر اُٹھے

سنہ ۱۹۴۵ء

کیا بحث اب بھی آہِ رسا کے اثر میں ہے
کچھ کچھ کمی سی شدّتِ دردِ جگر میں ہے

چل جادۂ وفا میں ذرا آنکھ کھول کر
کھٹکا ہزار طرح کا اس رہ گذر میں ہے

آتی ہے کس چمن سے یہ اٹکھیلوں کے ساتھ
ایک خاص تازگی جو نسیم سحر میں ہے

کس نے تمھیں حسینِ دو عالم بنا دیا
داغِ آتشِ حسد سے قمر کے جگر میں ہے

قاتل کے پاؤں پڑتا ہوں مقتل میں وقتِ قتل
طے راہِ عشق جلد ہو سودا یہ سر میں ہے

پرواز ابھی بلند ہو کچھ اور اے خیال
یہ اوجِ چرخ تو میری حدِّ نظر میں ہے
کیونکر سناؤں ان کو میں اب واقعاتِ دل
اک جوشِ اشک آج میری چشمِ تر میں ہے
ممکن نہیں مٹے کبھی آزادیوں کی دھن
زنداںیوں ہم ہیں مگر دل سفر میں ہے
ہم محوِ دید ایسے رہے ہوش کچھ نہ تھا
دل کب گیا یہ رازِ فریبِ نظر میں ہے
گم کردہ راہِ شوق تمہیں اک نہیں ہو شوق
صحرا نوردِ خضر بھی اس رہ گذر میں ہے
سنہ ۱۹۴۵ء

کاش پیدا اک نوا ہو سازِ پر اسرار سے
نغمۂ نو کھینچ سکیں ہر تارِ نغمہ بار سے
آہِ حبِّ جاں پر محرومیٔ دیدار سے
حسرتیں رو ئیں لپٹ کر جانِ ملتِ بیمار سے
باغِ عالم کی فضا دل کو تو اب بھاتی نہیں
اور ہوتا ہے پریشاں نکہتِ گلزار سے
ہیں یہ ذراتِ پریشاں بھی سبق آموزِ عشق
شرط یہ ہے ان دیکھو دیدۂ بیدار سے
ہوش کھو دیتا ہے ساقی ایک ہی جامِ سفال
پوچھینگے یہ رازِ میخانہ کسی سرشار سے
دیکھ کر دامن کو خالی دل بھر آیا ہجر میں
حیف کیا کیا تھیں امیدیں چشمِ گوہر بار سے